بھارت کے فرعون
بھارتی دہشت گرد
اے حمید
50

میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔

اس دوران میں دو تین آدمیوں سے ٹکرایا۔ سکھ فوجی میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ مجھے ان کی "پکڑ لو۔ پاکستانی جاسوس ہے" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سکھ فوجی مجھ پر پیچھے سے فائر نہیں کر سکتا تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر تھے۔ پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔ سامنے ریلوے یارڈ آ گیا جہاں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میں جس رفتار سے بھاگ رہا تھا میرا دماغ اس سے دوگنی رفتار سے سوچ رہا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے اپنے آپ کو کیسے بچانا ہے۔ ریل کی پٹڑیوں میں میں آسانی سے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ وہاں لوگ بھی نہیں تھے۔ سکھ فوجی تربیت یافتہ کیپٹن تھا۔ وہ بڑی آسانی سے پستول کا فائر کر کے مجھے گرا سکتا تھا۔ جہاں پلیٹ فارم ختم ہوا وہاں مجھے بائیں جانب مال گاڑی کا ڈبہ کھڑا نظر آیا۔ میں تیزی سے اس ڈبے کے پیچھے ہو گیا۔ سامنے ریلوے گودام کا صحن تھا جہاں ٹرک پر سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ "پکڑ لو۔ پاکستانی جاسوس ہے" کی آوازوں نے میرے لئے بے حد مشکل پیدا کر دی تھی۔ جیسے ہی میں گودام کے صحن میں داخل ہوا۔ مزدوروں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مجھے پکڑنے کے لئے بازو پھیلا دیئے۔ عین اسی لمحے پستول کے دو تین فائر ہوئے۔ یہ ہوائی فائر ہی ہو سکتے تھے۔ سکھ فوجی مزدوروں کے ہوتے ہوئے مجھ پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔

میں مزدوروں کو دھکے دے کر نکل گیا۔ ایک سکھ مزدور میرے پیچھے دوڑا۔ میں گودام کے پیچھے نکل آیا۔ یہاں چار پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ میں نے دیوار پر چڑھ کر

دوسری طرف چھلانگ لگادی۔ میں اسٹیشن کے باہر سڑک پر آگیا تھا۔ مجھے بہت سے تانگے اور رکشے کھڑے نظر آئے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں رکشے میں گھس کر ڈرائیور سے کہتا کہ چلو۔ لوگوں کا شور میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ میں سڑک پار کرنے کے لئے دوڑا تو اچانک ایک سکھ سکوٹر سوار میرے سامنے آگیا۔ اس نے ایک دم بریک لگائی۔ میں نے اسے دھکا دے کر سکوٹر سے گرادیا۔ سکوٹر بھی ایک طرف گر پڑا سکوٹر کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے انتہائی تیزی سے سکوٹر کو اٹھایا اچھل کر اس پر بیٹھا اور ایک دم سے اس کی رفتار تیز کر کے جس طرف سکوٹر کا منہ تھا اسی طرف نکل گیا۔ ایک تانگے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں پوری رفتار سے سکوٹر بھگائے لئے جا رہا تھا۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ سڑک کی ایک جانب ریلوے لائن کی دیوار تھی جہاں سگنل کے کھمبے نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ سڑک آگے کس طرف جاتی ہے۔ میں سکوٹر کو فل سپیڈ پر بھگائے لئے جا رہا تھا۔ سکوٹر میرا ساتھ دے رہا تھا۔

آگے ریلوے کا پل آگیا۔ میں نے سکوٹر کو پل پر ڈالنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک رکشا بڑی تیز رفتاری سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ یقیناً سکھ فوجی اس میں بیٹھا تھا اور اس نے رکشا میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ ریلوے پل پر کافی ٹریفک تھا اور دونوں طرف سے سواریاں آجا رہی تھیں۔ میں جتنی تیز وہاں سکوٹر چلا سکتا تھا۔ چلاتے ہوئے پل عبور کر گیا دوسری طرف سڑک کی دونوں جانب ہمارے لاہور کے گلبرگ کی طرز کی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں وہاں سے بھی نکل گیا۔ میں کسی ایسی چھوٹی سڑک یا تنگ راستے کی تلاش میں تھا جہاں سے میرے پیچھے لگا ہوا رکشا نہ گزر سکے۔ ایک جگہ کوٹھیوں کے عقب میں چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ اس کی ایک جانب درخت ہی درخت تھے اور دوسری جانب یعنی نہر کے کنارے اور کوٹھیوں کے پچھواڑوں کے درمیان بڑا تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ میرا سکوٹر وہاں سے گزر سکتا تھا مگر رکشا نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ راستہ آگے کس طرف جاتا ہے میں نے سکوٹر ادھر موڑ دیا۔ یہ غیر ہموار

راستہ تھا۔ سکوٹر اچھل اچھل کر چل رہا تھا۔ یہ تنگ راستہ ختم ہوا تو آگے پھر ایک سڑک آگئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ واقعی ایک رکشا تنگ راستے کے پاس آکر رکا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لئے میں خطرے سے باہر ہوگیا تھا۔ لیکن میں دشمنوں کے شہر میں تھا۔ اس شہر کے نشیب و فراز سے واقف بھی نہیں تھا۔ میرے پاکستانی جاسوس ہونے کا اعلان ہو چکا تھا۔ پولیس کو بھی اطلاع مل چکی ہوگی۔ کوئی تعجب نہیں تھا کہ اگلے چوک میں پولیس گھیرا ڈالے موجود ہو۔ مجھے جتنی جلدی ہوسکے اس شہر سے باہر نکل جانا چاہئے تھا۔ میرا رخ مشرق کی طرف تھا۔

کسی زمانے میں لدھیانہ شہر میں مسلمانوں کی بڑی زبردست آبادی تھی۔ اس شہر کے سیاسی' علمی اور دینی بصیرت رکھنے والے عالم فاضل مسلمانوں کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ کیسے کیسے ادیب' شاعر' سیاسی راہ نما اور علماء کرام لدھیانے میں رہا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کی لدھیانے شہر کے تمدن پر گہری چھاپ تھی۔ قیام پاکستان کے بعد لدھیانے کے مسلمانوں پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اور لدھیانے کی سرزمین زندہ مسلمانوں کے وجود سے محروم ہوگئی۔ اگر لدھیانے میں مسلمان رہ رہے ہوتے تو مجھے کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل سکتی تھی۔ لیکن تاریخ بدل چکی تھی۔ لدھیانے میں ایک بھی مسلمان کا گھر نہیں بچا تھا۔ ان کے گھروں کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا تھا اور باہر سے ہندو سکھ آکر آباد ہوگئے تھے۔ میرا سکوٹر سڑک پر بھاگا جا رہا تھا اور میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت مجھے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں کچھ دیر کے لئے چھپ جاؤں۔ کیونکہ شہر کی پولیس نے یقینی طور پر سٹیشن کے اردگرد کے علاقے کی ناکہ بندی کرلی تھی اور سڑک پر کسی بھی جگہ لدھیانہ پولیس مجھے پکڑ سکتی تھی۔ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ میں نہتا تھا۔ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ اگر پستول ہوتا بھی تو میں نکل کر سامنے آئی ہوئی شہر کی مسلح پولیس کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

دور سڑک پر مجھے کچھ ٹرک قسم کی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے پولیس نے سڑک روک رکھی ہو۔ میں نے سکوٹر سڑک سے اتار لیا اور درختوں کے پیچھے آکر سکوٹر کو روکا۔ اسے وہیں چھوڑا اور ایک کھیت میں گھس گیا۔ یہ آبادی کے اندر شہر کے دو چار کھیت تھے جن کے آگے پھر آبادی کے مکان شروع ہو گئے تھے۔ میں دوڑنے کی بجائے کھیت میں تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ فصل زیادہ اونچی نہیں تھی اور میری کمر تک آتی تھی۔ میں دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پتلی پگ ڈنڈی پر چل رہا تھا۔ کھیت ختم ہو گئے۔

رات کا وقت ہوتا تو اندھیرا مجھے چھپا لیتا۔ مگر یہ دن کا وقت تھا۔ شروع نومبر کا آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میری تصویر اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ کوئی بھی پولیس والا مجھے پہچان سکتا تھا۔ یہ بات بھی تھی کہ جو سکھ میرے پیچھے لگا ہوا تھا وہ فوجی تھا اس نے لدھیانے کی ملٹری پولیس کو بھی ضرور خبر کر دی ہوگی اور ملٹری پولیس بھی اس علاقے میں میری طرف بڑھ رہی ہوگی۔ میرے لئے کسی جگہ چھپ جانا بے حد ضروری تھا اور چھپنے کے لئے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کوئی میری مخبری نہ کر سکے اور پولیس مجھے پکڑ نہ سکے۔ میں کھیتوں سے نکل کر ٹاہلی کے درختوں کے نیچے سے ہو کر گزر رہا تھا کہ اچانک سامنے ایک چھوٹا سا چرچ یعنی گرجا گھر نظر پڑا۔ گرجے کا چھوٹا کچا احاطہ تھا۔ احاطے کے اندر گرجا گھر کی پرانی عمارت تھی۔ اس کا بڑا دروازہ بند تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے گرجا گھر کے پادری صاحب یعنی فادر کے پاس پناہ مل سکتی ہے۔ عیسائی ہونے کے ناطے فادر میں ہندو سکھوں والا تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کا شدید جذبہ نہیں ہوگا۔ اس کا مجھے بھارت کے فرعونوں کے درمیان اپنے قیام کے دوران تجربہ بھی ہو چکا تھا۔

میں جلدی سے چرچ کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے بھینس بندھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی اس کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے میری طرف بالکل نہ دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ میں گرجا گھر کے ہال کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھوٹا سا ہال کمرہ تھا۔ دو رویہ بنچ بچھے تھے سامنے قربان گاہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور

حضرت بی بی مریم علیہ السلام کے مجسموں کے سامنے تین چار موم بتیاں روشن تھیں۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے دروازے میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ مجھے دو آدمی باہر سڑک پر ایک طرف کو دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ جن لوگوں سے مجھے خطرہ تھا وہ میرا پیچھا کرتے یہاں تک آ گئے تھے۔ میں خالی بنچوں کے درمیان سے جلدی جلدی چلتا قربان گاہ کی ایک جانب آ کر رک گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے کس طرف چلا جاؤں؟

قربان گاہ اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی اور اس کے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک پادری صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

پادری صاحب کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ دبلا جسم تھا۔ رنگ سانولا تھا۔ لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی۔ سر کے خشخشی بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ چہرے پر بڑی شفیق مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔

"فادر! کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا لیجئے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں کوئی چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں"

پادری صاحب ایک لمحے کے لئے مسکراتے ہوئے شفیق چہرے سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"میرے ساتھ آجاؤ بیٹا"

میں ان کے پیچھے ہو گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ جس میں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ ایک جانب تہہ کیا ہوا کمبل پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ دھیمی روشنی والا بلب لٹک رہا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ بیٹا اور مجھے بتاؤ کہ لوگ تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گرجے کے ہال کمرے کی جانب سے بھاری بھاری قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے پادری صاحب کا نام لے کر انہیں بلایا۔ پادری صاحب

نے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو میں دیکھتا ہوں کون ہیں"

میں نے کہا۔

"فادر! پولیس ہوگی۔ پلیز انہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائیے گا۔ میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ میں چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں"

پادری صاحب نے ہاتھ اوپر اٹھا کر مجھے بڑی نرم آواز میں کہا۔

"مت گھبراؤ بیٹا۔ مت گھبراؤ۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میں جلد
سے دروازے کے پاس آکر دروازے کی باریک درز میں سے ہال کمرے میں دیکھنے لگا
میرا خدشہ درست تھا۔ گرجا گھر کے چھوٹے سے ہال کمرے میں پولیس کے آدمی کھڑے
تھے۔ ان میں تین سکھ سپاہی تھے اور ایک ان کے ساتھ ہندو انسپکٹر یا تھانیدار تھا۔ وہ ہا
کمرے کے دروازے سے کافی آگے آکر بنچوں کے درمیان کھڑے تھے۔

پادری صاحب قربان گاہ کی سیڑھیاں اتر کو پولیس کے سپاہیوں کے پاس جا کر ان
باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی صرف ہلکی ہلکی آوازیں ہی آرہی تھیں۔ لفظ سمجھ میں نہ
آرہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن اس وقت ضرور تیز ہوگئی تھی یہ بات صاف ظاہر
کہ پولیس پادری صاحب سے میرے بارے میں ہی پوچھ رہی تھی اور اگر پادری صاحب
پولیس کو بتا دیتے ہیں کہ جس پاکستانی کمانڈو کی انہیں تلاش ہے وہ اندر کوٹھڑی میں چھ
کر بیٹھا ہوا ہے تو اس کوٹھڑی میں سے فرار ہونے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا اور
پکڑا جانا یقینی تھا۔ میں جذبات کی ہیجانی کیفیت کے ساتھ دروازے کے ساتھ لگا باریک
میں سے پادری صاحب کو پولیس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ پادری صاحب
باتیں کرتے ہوئے تھانیدار کے کسی سوال کے جواب میں نفی میں سر ہلایا تو میں سمجھ گیا
انہوں نے پولیس کو میرے بارے میں نہیں بتایا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ تھانیدار پاد
صاحب سے زور دے کر کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے پادری صاحب سے ہاتھ ملایا

سپاہیوں کو لے کر ہال کمرے سے نکل گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں دروازے سے
ہٹ کر دری پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں پادری صاحب بھی اندر آگئے۔ وہ دروازہ بند کر کے وہیں کھڑے ہو کر مجھے
گہری نگاہوں سے تکنے لگے۔ میں بھی انہیں تکنے لگا۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ
غائب ہو چکی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آکر دری پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"بیٹا! مجھے پولیس کی زبانی معلوم ہو گیا ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ یہ بات میرے
ضمیر کو ہرگز گوارا نہیں کہ میں اپنے ملک کے دشمن کی مدد کروں اور اسے پولیس کے
حوالے نہ کروں۔ لیکن میں تمہیں پناہ دے چکا ہوں۔ یہ بات بھی میرے مسلک کے خلاف
ہے کہ تمہیں پناہ دینے کے بعد پولیس کے حوالے کردوں۔ ہم ہندوستان کے باشندے
ہیں۔ ہماری وفاداریاں اپنے ملک کے ساتھ ہیں۔"

پادری صاحب اپنے طور پر بالکل درست کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے اور
اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"فادر! میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ ہم لوگ اپنی آزادی
کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کشمیر پر بھارت نے
اپنی فوج کے ذریعے وہاں کی مسلمان اکثریت کی مرضی کے خلاف قبضہ کر رکھا ہے۔ کیا ہم
حق بجانب نہیں ہیں؟ آپ کے بزرگوں نے بھی ملک ملک سے آکر صلیبی جنگوں میں
شرکت کی تھی۔ میں بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ آزادی کشمیر کے لئے جہاد کر رہا
ہوں"

پادری صاحب کہنے لگے۔

"میں تمہاری بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں ایک رات
سے زیادہ پناہ نہیں دے سکتا۔ تمہیں آدھی رات کے بعد یہاں سے نکل جانا ہوگا۔ میں
تمہارے لئے بس اتنا ہی کر سکتا ہوں"

پادری صاحب کا میری نظروں میں احترام بڑھ گیا تھا۔ اپنے طور پر انہیں ایسا ہی کہنا

چاہئے تھا۔ میرے لئے یہی بہت غنیمت تھا کہ انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اور ایک رات کے لئے چرچ میں پناہ دے دی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ میں جالندھر جانا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے۔

"رات کو یہاں سے جالندھر کی طرف گاڑیاں جاتی ہی رہتی ہیں۔ مگر پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ ان کے پاس تمہارا فوٹو بھی ہے۔ جو اخبار میں چھپا ہوا ہے۔ سٹیشن پر جاؤ گے تو پکڑے جاؤ گے رات کو جالندھر کی طرف لاریاں نہیں چلتیں مگر ٹرکوں کے اڈے سے ٹرک مال لے کر ضرور جاتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ یہاں سے رات کے وقت نکل کر ٹرکوں کے اڈے پر چلے جاؤ اور کسی ٹرک میں بیٹھ کر جالندھر جانے کی کوشش کرو۔ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو میں تمہیں پچاس روپے دے دوں گا۔"

پادری صاحب نے اپنے لمبے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی صدری میں سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔ میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے پادری صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے پچاس کا نوٹ نہ لیا اور ان سے ٹرکوں کے اڈے کے بارے میں پوچھا کہ وہ وہاں سے کتنی دور اور کس طرف۔ پادری صاحب نے کہا۔

"چرچ کے پیچھے جو سڑک جاتی ہے اس پر چلتے جاؤ گے تو ایک چوک آئے گا۔ وہاں سے دائیں طرف مڑ جانا۔ وہاں کنک منڈی ہے ٹرکوں کا اڈہ بھی وہیں ہے۔ ایک بات میں تمہیں ضرور کہنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ اگر تم پکڑے گئے تو پولیس کو یہ نہ بتانا کہ میں تمہیں پناہ دی تھی۔"

میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"محترم! میں محسن کش نہیں ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ پولیس چاہے مجھے اذیت کیوں نہ دے۔ میری زبان پر آپ کا نام کبھی نہیں آئے گا۔"

پادری صاحب نے صلیب کا نشان بنا کر مجھے دعا دی اور کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے گرجا گھر کے اندر ہی ایک اور چھوٹے سے کمرے میں لے آئے جہاں ایک چارپائی بھی پڑی تھی۔ انہوں نے مجھے کمبل لا کر دیا اور کہا۔

"یہاں تمہارے پاس سوائے میرے اور کوئی نہیں آئے گا۔ تم بھی اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔"

میں نے سارا دن اس کمرے میں گزار دیا۔ پادری صاحب نے مجھے کھانا بھی کھلایا۔ شام کو چائے بھی پلائی۔ پھر رات کو بھی کھانا دیا جب رات گہری ہو گئی تو میں وہاں سے نکلنے کا پروگرام بنانے لگا۔ پادری صاحب رات کے دو بجے میرے پاس آ کر کہنے لگے۔

"اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ سڑکیں خالی پڑی ہیں۔ تمہارے لئے یہاں سے نکلنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہے۔"

میں نے اٹھ کر پادری صاحب سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"تمہیں خداوند کے سپرد کیا"

انہوں نے مجھے گرجا گھر کی عمارت کے پچھواڑے سے باہر نکال دیا۔ نومبر کی رات سرد تھی۔ ابھی اتنی سردی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی لوگ مکانوں کے اندر سوتے تھے۔ بازار میں کہیں کسی کی چارپائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پادری صاحب نے مجھے جس طرح بتایا تھا میں اسی حساب سے گرجا گھر سے نکل کر عقبی سڑک پر آ گیا۔ لدھیانہ شہر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی جانب سے کسی موٹر رکشا کی دور سے آواز آ جاتی تھی۔ میں سڑک پر چلتے چلتے چوک میں آ گیا۔ یہاں سے بائیں جانب ہوا تو کچھ فاصلے پر ایک ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ ٹرکوں کا اڈہ تھا۔ ایک ٹرک چلنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا مجھے ڈرائیور سے بات کرنی چاہئے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ رکھی ہو اور وہ مجھے دیکھتے ہی وہیں پکڑ کر شور مچا دے۔ معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ میں ٹرک اڈے سے ذرا فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ٹرک مجھ سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور دو

آدمیوں کے ایک دوسرے سے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ٹرک روشنی میں کھڑا تھا۔ اس پر لدی ہوئی بوریاں مجھے نظر آرہی تھیں۔ ٹرک کے پیچھے دو ڈھائی فٹ چوڑا تختہ لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سکھ لڑکا ایک طرف سے نکل کر ٹرک کے پیچھے آیا۔ اس نے نیچے لٹکتا ہوا رسہ اٹھا کر اوپر بوریوں پر ڈالا اور لدھیانے کے پنجابی لہجے میں اپنے ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا۔ لڑکا دوڑ کر ٹرک کی اگلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ٹرک کا انجن پہلے سے چل رہا تھا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا اور ٹرک آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ٹرک اڈے سے تھوڑا آگے گیا جہاں ذرا اندھیرا تھا تو میں دوڑ کر ٹرک کے پاس آیا اور عقبی تختے کو پکڑ کر ٹرک میں اچھل کر بوریوں کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ میں سر نیچے کر کے بیٹھ سکتا تھا اور باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹرک لدھیانہ شہر کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کا رخ چونکہ جالندھر کی طرف تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ یہ ٹرک جالندھر کی طرف ہی جا رہا ہے۔ یہ خطرہ ضرور لگا تھا کہ راستے میں کہیں پولیس کی چیک پوسٹ نہ ہو اور پولیس چیکنگ نہ کرے۔ میں کبھی کبھی سر اونچا کر کے سڑک کو دیکھ لیتا تھا۔ سڑک پر بتیاں ساتھ ساتھ روشن تھیں۔ آبادی کے مکان بھی نظر آجاتے تھے۔ آخر ٹرک ایک ایسی سڑک پر آگیا جو مجھے جی ٹی روڈ معلوم ہو رہی تھی۔ پیچھے دور تک سڑک خالی پڑی تھی۔ دونوں جانب درخت بھی تھے اور بجلی کے کھمبے بھی دور دور لگے ہوئے تھے۔ ٹرک کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ ٹرک یقینی طور پر لدھیانہ شہر سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ مجھے صرف اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ راستے میں اگر کسی جگہ ٹرک کھڑا ہو جائے تو مجھے ٹرک سے اتر کر ادھر ادھر چھپ جانا تھا اور ٹرک کے دوبارہ چلنے پر دوڑ کر اس میں سوار ہو جانا تھا۔ ٹرک پر بوریاں کچھ اس طرح اوپر نیچے لدی ہوئی تھیں کہ ان کے اندر چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ ٹرک کافی رفتار سے جا رہا تھا۔ لدھیانے سے جالندھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا لاہور سے گوجرانوالہ کا

ہے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ راستے میں پھگواڑہ ریلوے اسٹیشن ضرور آتا ہے۔ اس کے بعد جالندھر آجاتا ہے۔ ایک تو سڑک خالی ہونے کی وجہ سے ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ دوسرے میں ٹرک کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے میرے اوپر آرہے تھے۔ اور مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن میں اس قسم کی سخت جانی کا عادی تھا۔ جیکٹ کے بٹن میں نے گردن تک بند کر لئے تھے اور بوریوں کی اوٹ میں جتنا سرد ہواؤں سے بچ سکتا تھا بچ کر بیٹھا ہوا تھا۔

ٹرک کافی دیر تک ایک سان چلتا رہا۔ راستے میں کسی جگہ نہ رکا۔ پولیس کی کوئی چیک پوسٹ بھی نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ جالندھر شہر میں داخل ہوتے ہی میں ٹرک سے چھلانگ لگادوں گا اور ریلوے لائن تلاش کر کے اس پر چلتا ہوا اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے ہوشیار پور جانے والی گاڑی میں بیٹھ کر جموں کی طرف نکل جاؤں گا۔ سڑک پر دائیں بائیں آبادی کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ پھگواڑہ شہر آرہا تھا۔ ٹرک وہاں نہ رکا۔ اور شہر کے درمیان سے ہو کر نکل گیا۔ یہ اچھا ہوا تھا ورنہ مجھے ٹرک سے نکل کر کسی طرف چھپنا پڑتا۔ پھگواڑہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ٹرک جی ٹی روڈ پر بھاگا جا رہا تھا۔ آخر جالندھر شہر کے مضافات کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ میں دائیں بائیں دور ریلوے سگنل کی بتی تلاش کر رہا تھا۔ تاکہ میں ٹرک سے اترتے ہی اس طرف کا رخ کر لوں۔ یہ جالندھر شہر ہی تھا۔ سڑک کشادہ ہو گئی تھی۔ دور دور کوٹھیوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ٹرک شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک ریلوے پل آگیا۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا کہ پل کے نیچے لائنیں بچھی ہوئی تھیں اور خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک انجن بھی شنٹ کرتا جا رہا تھا۔ یہی اس وقت میرا ٹارگٹ تھا۔ اب میں یہ انتظار کرنے لگا کہ کہاں ٹرک کی رفتار ذرا کم ہو اور میں سڑک پر چھلانگ لگادوں۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد ویسے ہی ٹرک کی سپیڈ کم ہو گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد ریلوے سگنل کی سبز اور سرخ روشنی کو دیکھ لیتا تھا۔ میں ریلوے لائن کے قریب ہی کسی جگہ اترنا چاہتا تھا۔ ایک جگہ سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے ٹرک کی رفتار مزید کم ہو گئی۔ میں نے ٹرک میں سے سڑک

پر چھلانگ لگا دی۔

کمانڈو ٹریننگ میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ چلتی گاڑی یا ٹرک میں سے چھلانگ لگائی ہو تو اپنا رخ ہمیشہ اس طرف ہونا چاہئے جس طرف گاڑی جا رہی ہو۔ اور چھلانگ لگاتے ہی اس طرف دوڑ پڑنا چاہئے۔ اس طرح سے کچھ بچت ہو جاتی ہے اور آدمی کو زیادہ چوٹیں نہیں لگتیں۔ میں نے بھی اپنا منہ ٹرک کی اگلی جانب کر کے ٹرک سے چھلانگ لگائی تھی۔ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی اس لئے میں آسانی سے اتر گیا تھا۔ ٹرک سے اترتے ہی میں اس طرف چل پڑا جس طرف مجھے ریلوے سگنل کی بتی نظر آ رہی تھی۔ ریلوے لائن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ صرف ایک دو کھیتوں میں سے مجھے گزرنا پڑا۔ رات کے تین ساڑھے تین بجے کا وقت ہو گا۔ سردی بھی تھی۔ کھیتوں پر اندھیرا تھا۔ ریلوے لائن پر چڑھتے ہی میں نے شمال کی جانب دیکھا تو مجھے کچھ فاصلے پر ریلوے سٹیشن کی جگمگاتی ہوئی کافی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ جالندھر کا ریلوے اسٹیشن ہی ہو سکتا تھا۔

لدھیانے سے امرتسر تک راستے میں ایک ہی بڑا شہر جالندھر آتا ہے۔ یہ بہت بڑا شہر تھا اور جالندھر ہی تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ جب سٹیشن قریب آیا تو لائن کے ساتھ ساتھ اونچی دیوار شروع ہو گئی۔ اب میں ریلوے لائن کی پٹڑی سے اتر کر دیوار کے ساتھ ہو گیا۔ کافی بڑا ریلوے یارڈ تھا۔ کہیں خالی ڈبے کھڑے تھے۔ کہیں انجن شنٹ کر رہا تھا۔ آخر میں اس جگہ آ گیا جہاں سے سٹیشن کا ایک پلیٹ فارم شروع ہوتا تھا۔ یہاں بورڈ لگا تھا جس پر انگریزی اور ہندی میں جالندھر سٹی لکھا ہوا تھا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب مجھے ایک تو جالندھر سے جموں توی شہر تک کا ٹکٹ خریدنا تھا اور دوسرے یہ معلوم کرنا تھا کہ جموں شہر کی جانب ٹرین کس وقت جائے گی۔ جس بات کا مجھ پر خوف سا طاری تھا وہ یہ تھی کہ صبح کے اخباروں میں میری تصویر چھپ چکی تھی جس میں مجھے پاکستانی جاسوس قرار دیا تھا۔ اور میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ اس وقت میرا جو حلیہ تھا تصویر اسی حلیے میں تھی اور میں بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنی تبدیلی کی کہ جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھ لیا اور

جیکٹ کے کالر اوپر اٹھا لئے۔

پلیٹ فارم پر کوئی رش نہیں تھا۔ میں پھر بھی احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو پلیٹ فارم کی روشنی سے بچاتا ہوا جس طرف اندھیرا تھا اس طرف سے ہوتا ہوا چل رہا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر کوئی گاڑی کھڑی نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے وہ خالی خالی تھا۔ ایک جگہ ایک سکھ قلی ریلوے لائن سے اوپر پلیٹ فارم پر چڑھ کر آیا تو میں نے اس سے جموں جانے والی گاڑی کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر بعد اسی پلیٹ فارم پر جموں سے گاڑی آئے گی۔ وہی گاڑی واپس جموں توی جائے گی۔ اب مجھے جموں کا ٹکٹ خریدنا تھا۔ سکھ قلی یہ کہہ کر آگے چل پڑا تھا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔

"سردار جی! آپ کی بڑی مہربانی ہو گی مجھے جموں کا ایک ٹکٹ لادیں۔ میرے پاؤں میں درد ہے۔ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔"

اور میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا سکھ قلی نے نوٹ لے لیا اور بولا۔

"یہیں سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ"

وہ چلا گیا۔ مجھے یہ چانس لینا ہی تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوچا اگر قلی ٹکٹ لے آیا تو بہت اچھا ہو گا۔ اگر نہ لایا تو میں کوئی دوسری ترکیب سوچوں گا۔ کیونکہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں خطرہ تھا کہ اگر پکڑا گیا تو مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ پلیٹ فارم کے درمیان میں خالی بنچ تھا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ سکھ قلی کچھ دور تک مجھے نظر آتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب مجھے یہ خیال آنے لگا کہ کہیں یہ قلی پولیس کو خبر نہ کر دے۔ یونہی مجھے وہم لگنے لگا کہ اس نے مجھے گھور کر بھی دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہونے لگے۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ ایک لمحے کے لئے اس نے میری طرف واقعی غور سے دیکھا تھا۔ کیونکہ جب میں اسے پچاس روپے کا نوٹ دینے کے لئے ایک قدم آگے ہوا تھا تو سامنے والے پلیٹ فارم کی روشنی میرے چہرے پر پڑی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران پلیٹ

فارم پر مسافر آنا شروع ہو گئے۔ میں اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور جدھر قلی گیا تھا ادھر دیکھنے لگا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں یا قلی کا انتظار کروں۔ اتنے میں سامنے کی جانب سے ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی۔ ٹرین رکی تو ڈبوں میں سے مسافر اترنے لگے۔ پلیٹ فارم پر ہل چل سی مچ گئی۔ معلوم ہوا ٹرین جموں سے آئی ہے۔ یہی ٹرین کچھ دیر بعد واپس جموں جانے والی ہے۔

اچانک میری نظر سکھ قلی پر پڑی۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا میری طرف چلا آرہا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ سکھ قلی نے آتے ہی مجھے جالندھر سے جموں توی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ اور باقی پیسے دیئے اور کہا۔

"یہ لیجئے مہاراج میری گاڑی آگئی ہے"

اور وہ ایک ڈبے کی طرف کسی مسافر کا سامان اٹھانے کے لئے دوڑ گیا۔ ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میں دل میں ہنس رہا تھا کہ میں نے خوامخواہ طرح طرح کے وسوسوں سے اپنے آپ کو پریشان کیا۔ کسی نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ جموں والی گاڑی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب میں اس میں سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف اطمینان سے روانہ ہو سکتا تھا۔ منزل اب مجھے سامنے نظر آرہی تھی۔

جموں کی طرف جو گاڑی جاتی ہے وہ جالندھر سے امرتسر کی بجائے ہوشیار پور والی لائن پر ہو جاتی ہے۔ اس لائن پر میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔ اس وقت آسمان پر صبح کاذب کا نور نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں ٹرین کے سب سے آخری ڈبے میں بیٹھ گیا اور بے چینی سے ٹرین کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ لمحات بڑے صبر آزما تھے۔ اگر دلی اور مشرقی پنجاب کے اخباروں میں پولیس کی جانب سے میری تصویر نہ چھپی ہوئی ہوتی تو میرے لئے کوئی اتنی زیادہ پریشانی نہ تھی۔ میں کئی بار پولیس کے تھانوں جیلوں اور ٹارچر سیلوں سے فرار ہو چکا تھا اور فرار ہونے کے بعد کمانڈر شیروان کے پاس خفیہ کیمپ گاہ میں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ جالندھر سے تیس پینتیس میل پیچھے مجھے ایک سکھ کیپٹن نے پہچان لیا تھا اور اب صرف ملٹری پولیس ہی نہیں مشرقی پنجاب کی پولیس بھی میرے

تعاقب میں تھی اور میں بہت حد تک ان کے محاصرے میں تھا۔

اتنے میں ٹرین کے گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سٹیشن سے نکلنے کے بعد ٹرین امرتسر والی لائن چھوڑ کر ہوشیار پور والے ٹریک پر آگئی۔ ابھی ریلوے یارڈ کی بتیاں روشن تھیں۔ آسمان پر صبح کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ٹرین جالندھر شہر کے مضافات میں سے نکل کر کھیتوں میں چلی جا رہی تھی۔ کھیتوں میں نومبر کی صبح کی ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ اب صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ مگر سردیوں کی صبح کی وجہ سے فضا دھندلی دھندلی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ کوئی چھوٹا سٹیشن آرہا تھا۔ اس طرف چلنے والی ریل گاڑیاں سبھی دیہاتی سٹیشنوں پر ٹھہرتی ہیں۔ میں نے کھڑکی میں سے سر آگے کر کے سامنے کی جانب دیکھا۔ دور کسی چھوٹے سٹیشن کے درخت نظر آرہے تھے۔ میں نے ڈبے میں مسافروں کا جائزہ لیا۔ سبھی دیہاتی ٹائپ کے مسافر تھے۔ کئی ایک نے گلابی رنگ کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور ڈوگری زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ سکھ بھی تھے۔ اوپر برتھ پر بھی کچھ مسافر سو رہے تھے۔ ٹرین کو ایک دم بریکیں لگیں اور چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ کسی مسافر نے کہا۔

"سگنل ڈاؤن نہیں ہوا ہے"

ٹرین سٹیشن آنے سے پہلے ہی کھیتوں میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ مجھے اگلے ڈبوں کی جانب وردیوں والے فوجی یا پولیس کے سپاہی نظر آئے۔ جس مصیبت کا خدشہ لگا ہوا تھا وہ نازل ہو گئی تھی۔ دوسرے ڈبے کے کچھ مسافر نیچے اتر گئے تھے۔ میں پیچھے ہٹ کر بیٹھا تھا اور کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باہر سے کسی مسافر نے ڈوگری زبان میں کسی کو بلند آواز میں کہا۔ کہ پولیس کسی مجرم کو تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بڑے اطمینان سے اٹھا اور دوسرے دروازے میں آکر انجن والے ڈبوں کی طرف دیکھا اس طرف پولیس کے تین

چار سپاہی کھڑے تھے مگر وہ میرے ڈبے سے ابھی کافی دور تھے۔ میں خاموشی سے نیچے اتر گیا۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ پیچھے کی جانب چلتا دوسرے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ اس ڈبے کے مسافر بھی کھڑکیوں پر جھکے باہر دیکھ رہے تھے۔ میں ڈبے میں چڑھ گیا اور دوسرے دروازے میں سے دوسری طرف اتر گیا۔ اس طرف مسافر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف چلتا مسافروں سے دور ہوتا گیا۔ میں تیز تیز چل کر مسافروں کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ٹرین کا آخری ڈبہ آ گیا۔ یہاں بھی کچھ مسافر ڈبے سے اتر کر کھڑے دور پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"ماراج جی کوئی قاتل جیل توڑ کر بھاگا ہوگا"

"مجھے تو کوئی پاکستانی جاسوس لگتا ہے ماراج"

میں ان لوگوں کے قریب سے بہت آہستہ آہستہ چلتا گزر گیا۔ ریلوے لائن اونچی تھی۔ نیچے ڈھلان میں جھاڑیاں تھیں۔ آگے ٹاہلی کے درختوں کے نیچے دور تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میں وہاں رک گیا۔ اگلے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ پولیس کی پوری گارڈ تھی۔ سپاہی تیز تیز چلتے ہمارے ڈبوں کی طرف آ رہے تھے۔ اب میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں آہستہ سے ریلوے لائن کی ڈھلان اتر کر جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں درختوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چل پڑا۔ یہ سارا علاقہ میرے لئے بے حد خطرناک تھا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی پولیس والا مجھے کھیتوں میں تیز تیز چلتا نہ دیکھ لے۔ درختوں کے پیچھے چلتے ہوئے مجھے ریل گاڑی کے ڈبے اور پولیس کے آدمی دور سے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی مجھے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن میں رک نہیں سکتا تھا۔ درختوں کی آڑ لیتا میں ٹرین سے دور ہوتا گیا۔ ایک جگہ کھیتوں میں اونچی فصل اگی ہوئی تھی۔ میں ان کھیتوں میں گھس گیا۔ یہ جوار کی فصل تھی۔ میں کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ جوار کے کھیت ختم ہو گئے۔ سبزی ترکاریوں کے کھیت شروع ہو گئے۔ یہاں میں چھپ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں ٹرین سے کافی دور نکل آیا تھا۔ کھیت میں ایک جگہ دو سکھ بیٹھے سبزیاں توڑ رہے تھے۔ میں فاصلے پر رہ کر آگے گزر

گیا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں کچے مکان تھے۔ یہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تالاب میں بھینسیں بیٹھی تھیں۔ ایک کھیت میں سکھ کسان ہل چلا رہا تھا۔ چلتے چلتے جب میں گاؤں سے کچھ فاصلے پر نکل گیا تو میں نے پیچھے مڑ کر ریل گاڑی کی طرف دیکھا۔ دور ریل گاڑی ابھی تک کھڑی تھی۔ پولیس کو کسی مخبر نے بڑی پکی اطلاع دی تھی کہ میں اسی ٹرین میں جموں کی طرف فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں گاؤں سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ یہ مشرقی پنجاب میں جالندھر کے ضلع کا دیہاتی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز شاداب تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کھیتوں میں زیادہ تر سکھ کسان ہی کام کرتے نظر آتے تھے۔ میں گاؤں کی آبادی سے دور رہ کر چل رہا تھا۔ ایک دو جگہ پر تھوڑی دیر بیٹھ بھی گیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہوشیار پور تک پیدل ہی سفر کروں گا۔ خواہ اس میں دو دن ہی لگ جائیں۔ ہوشیار پور سے نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں سے کسی لاری یا ٹرک میں بیٹھ کر کٹھوعہ پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ایک بار کٹھوعہ پہنچ گیا تو پھر جموں پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے میں جالندھر سے دور ہو رہا تھا میں آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ مجھے کم از کم دو دن تک پیدل سفر کرنا ہوگا۔ میں نے بڑے بڑے دشوار گزار جنگلوں میں پیدل سفر کیا تھا۔ ان آباد میدانی علاقوں میں سفر کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے کسی بھی جگہ سے کھانے کو کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ ابھی مجھے بھوک بھی نہیں لگی تھی۔ سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ سردی کی رات والی شدت کم ہو گئی تھی۔ مجھے ریل گاڑی سے الگ ہوئے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے جب میں سکول میں پڑھا کرتا تھا تو ہم اپنے میاں جی کے ساتھ جب کبھی کسی دوسرے شہر لاری میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے تو راستے میں جو کوئی گاؤں آتا اس میں ایک نہ ایک مسجد ضرور ہوتی تھی جس کے دو سفید مینار دور سے نظر آ جاتے تھے۔ اب تک میں چار گاؤں کے قریب سے گزرا تھا مگر کسی گاؤں میں مجھے کوئی مسجد نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی سنتالیس 1947ء میں جب پاکستان بنا تھا تو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا ہندو سکھوں نے وحشیانہ قتل عام کیا تھا۔ بچے

کچھ مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ اب مشرقی پنجاب کے ان دیہات میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ یہاں مسلمانوں کی جو مسجدیں تھیں انہیں ہندو سکھوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ آگ لگا کر نذر آتش کر دیا تھا۔ ان دیہات کے باہر مجھے یا مندر نظر آئے تھے یا گوردوارے جہاں سکھ عبادت کرتے ہیں۔ مسجد ایک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

دیہاتی کسان بھی ہندو تھے یا سکھ۔ کوئی مسلمان نہیں تھا۔ سکھ زیادہ نظر آئے تھے۔ چلتے چلتے میں ایک اینٹوں کے بھٹے کے پاس پہنچا۔ یہاں آوے کے اوپر بہت بڑی چمنی لگی ہوئی تھی جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایک طرف پختہ اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک سکھ تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ میں تھوڑے فاصلے پر سے آگے گزر گیا۔ آگے ایک سیم نالہ تھا۔ اس کا پل تھا پل کی دوسری جانب گاؤں تھا جہاں کچی گراؤنڈ میں سکھ اور ہندو لڑکے کھیل رہے تھے۔ میں یہاں سے بھی آگے گزر گیا۔ درختوں کے پیچھے بہت دور اونچے نیچے ٹیلوں کے دھندلے سے خاکے نظر آنے لگے تھے۔ یہ ہوشیار پور کی ترائی کا علاقہ تھا مگر ابھی یہ ٹیلے بہت دور تھے۔ میں گاؤں سے کچھ فاصلے پر جا کر ایک کھیت کے کنارے کیکر کے درخت کے نیچے تھکاوٹ دور کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہاں کوئی کنواں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی آگئی۔ میں نے ندی پر منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ جوتے اتار کر پاؤں دھوئے۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اب مجھے کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ کیا میں ہوشیار پور کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ کیونکہ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ ہوشیار پور تک ٹرین میں بیٹھ کر دو ایک بار ضرور سفر کر چکا تھا مگر ادھر ریلوے لائن کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ ریلوے لائن سے کافی ہٹا ہوا علاقہ تھا۔ ندی پر کچھ دور جانے کے بعد ایک پل آگیا۔ پل پر سے ایک سکھ لڑکا گائیوں اور بھینسوں کو لے کر جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہوشیار پور جانے والی سڑک کس طرف ہے وہ رک گیا۔ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کچھ دوابے اور کچھ

ہوشیار پوری پنجابی لہجے میں اس نے مجھے بتایا کہ میں جس طرف جا رہا ہوں آگے دو کوس پر امرتسر بٹالے والی سڑک آجاتی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بٹالے امرتسر کی طرف نہیں جانا۔ میں ہوشیار پور جانا چاہتا ہوں۔ سکھ لڑکے کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے ندی کے دوسرے کنارے کی طرف چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تم اس طرف جاؤ"

یہ کہہ کر وہ مویشیوں کے پیچھے دوڑ پڑا جو اس دوران کافی آگے نکل گئے تھے۔ میں ندی کے دوسری کنارے پر ہو گیا۔ پل کے قریب ہی سے ایک کچا راستہ اس طرف جاتا تھا۔ جس طرف سکھ لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ کچی سڑک پر مٹی ہی مٹی تھی۔ یہ ٹوٹا پھوٹا کچا راستہ تھا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں طرف تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ میں چلتا چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ اس کچی سڑک پر بڑی مشکل سے چلنے کے بعد ایک کھال آگیا۔ یہاں بوہڑ کا بڑا گھنا درخت تھا جس کے نیچے ایک کٹیا بنی ہوئی تھی۔ درخت کے تنے میں رام اور سیتا کی دو مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے آگے چاول سیندور اور رتن جو کے پھول پڑے تھے۔ وہاں نہ کوئی پجاری تھا نہ پوجا کرنے والا تھا۔ اس گھنے درخت کی دوسری طرف کچھ فاصلے پر مجھے ایک اونچے ٹبے پر بنا ہوا گاؤں نظر پڑا۔ یہ کچا راستہ اس گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ مجھے گاؤں سے بچ کر نکلنا تھا۔ میں راستے سے ہٹ کر کھیتوں میں چلنے لگا۔ گاؤں جب پیچھے رہ گیا تو ایک جگہ ایک عورت دانے بھون رہی تھی۔ دو تین بچے اس کے سامنے بیٹھے کڑاہی میں جوار کو بھنتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بھنی ہوئی جوار کی خوشبو آئی تو میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر بچوں کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب بچے اپنی اپنی جھولیوں میں بھنی ہوئی جوار کے دانے ڈلوا کر چلے گئے تو میں دانے بھوننے والی عورت کے پاس آگیا۔

میں نے پنجابی میں کہا۔

"بھن جی چار آنے کی جوار بھون دو"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جھولے میں سے جوار کے دانوں کی تین مٹھیاں

کڑاہی میں ڈالیں اور بھٹی میں سرکنڈے ڈال کر آگ کو تھوڑا تیز کر دیا۔ عورت نہ بوڑھی تھی نہ جوان۔ میں اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کڑاہی کی ریت میں سرکنڈوں کا بنا ہوا جھاڑو چلانے لگی۔

"تم کہاں جا رہے ہو پتر؟"

میں نے کہا۔

"بہن جی اگلے گاؤں جا رہا ہوں"

میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ اسے میں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں ہوشیار پور جا رہا ہوں۔ سکھ لڑکے کو میں نے بتا دیا تھا کیونکہ وہ خود ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ مگر یہ عورت مستقل طور پر وہاں بیٹھ کر دانے بھونتی تھی۔ پیچھے سے آکر کوئی اس سے میرے بارے میں پوچھ سکتا تھا کہ اس حلیے کا نوجوان تو ادھر سے نہیں گزرا۔ اتنی احتیاط میں غیر ارادی طور پر کر لیا کرتا تھا۔ وہ دانے بھون رہی تھی اور میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے معلوم کر لیا کہ اس طرف کو جو سڑک ہوشیار پور کو جاتی ہے وہ وہاں سے پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر ہے یہ کل فاصلہ پچیس میل بنتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ضلع جالندھر کے شمال مشرقی علاقے میں کافی اندر کی طرف نکل آیا تھا۔ اس سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ آگے سوڈھی سکھوں کا ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ جہاں ایک گوردوارہ بھی ہے۔ اس کے آگے مصلیوں کے دو گاؤں ہیں۔ اس کے آگے بڑی نہر آجاتی ہے اور نہر کی دوسری طرف بیروالی کا قصبہ ہے جہاں پولیس کا تھانہ بھی ہے۔ میں تھانے کا سن کر محتاط ہو گیا۔ مجھے اس طرف سے بچ کر آگے جانا تھا۔ میں نے بھنی ہوئی جوار پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں ڈالی اور آگے چل پڑا۔

اب کھیتوں کی جگہ رڑا میدان تھا جہاں کلر والی زمین تھی۔ جو کلر سے سفیدی مائل ہو رہی تھی۔ تھوہر کی جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر دو تین درخت ایک ساتھ اگے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں ان درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ بھنی ہوئی جوار نے میری بھوک ختم کر دی تھی۔ اب پھر پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں پانی کی تلاش

میں ادھر ادھر نہیں جانا چاہتا تھا میں وہیں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دوپہر ڈھلنا شروع ہو گئی تو میں اٹھ کر پھر چلنے لگا۔ تین ایک میل چلنے کے بعد ایک کافی بڑا گاؤں نظر پڑا۔ یہ بھی اونچے ٹیبے پر واقع تھا۔ اس کے ایک گوردوارے کا گنبد اور زرد رنگ کا اونچا جھنڈا دور سے نظر آرہا تھا۔ یہ ضرور سوڈھی سکھوں کا گاؤں تھا۔ میں اس گاؤں سے بچ کر جلدی جلدی آگے نکل گیا۔ دانے بھوننے والی کے کہنے کے مطابق سوڈھی سکھوں کے گاؤں کے آگے مصلیوں کے گاؤں تھے۔ چلتے چلتے دن ڈھل گیا۔ سورج مغرب میں چھپنے لگا۔ میں واقعی چلتے چلتے اب تھک گیا تھا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنا چاہتا تھا جہاں میں شام اور رات کا کچھ حصہ گزار سکوں۔ میرا ارادہ آدھی رات تک آرام کرنے اور اس کے بعد دوبارہ سفر پر نکل پڑنے کا تھا۔ آدھی رات کے بعد میں زیادہ محفوظ رہ کر ہوشیار پور جانے والی سڑک تک سفر کر سکتا تھا۔

جب سوڈھی سکھوں کا گاؤں پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دن کی روشنی سردیوں کی شام کے دھندلکوں میں گم ہونے لگی۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تھی جہاں میں رات بسر کر سکتا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر ایسی کوئی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک جگہ ٹھہر گئی۔ دور سے ہلکے ہلکے دھندلکے میں یہ کوئی مکان نظر آرہا تھا۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی مسجد تھی جس کے مینار ڈھے چکے ہیں۔ صرف محراب باقی ہے جس کے اوپر کی تین برجیاں سلامت تھیں۔ محراب کے اوپر چھت بھی آدھی ڈھے چکی تھی۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ یقیناً کوئی مسجد تھی۔ میں حیران تھا کہ اس مسجد کو شہید کر دیا گیا تھا تو اس کا آدھا حصہ کیسے بچا رہ گیا۔ بہرحال جب مجھے اس کھنڈر کے مسجد ہونے کا یقین ہو گیا تو میں اس کے عقب میں آگیا۔ یہاں ایک کنواں تھا۔ جس کا چبوترہ بھی ڈھے چکا تھا۔ اس میں جھانک کر دیکھا۔ یہ اندھا اور ویران کنواں تھا۔ کبھی اس کے پاس بیٹھ کر نمازی وضو کرتے ہوں گے مگر اب وہاں نہ کنواں تھا۔ نہ مسجد تھی اور نہ وہ نمازی ہی باقی رہے تھے۔ ذرا پیچھے گیا تو یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ کیکر

اور دھریک کے پتلے پتلے درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی جو نالے کی شکل کی تھی بہہ رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ پانی چلو میں بھر کر پیا۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ آگے کچھ کھیت تھے۔ شاید پیچھے کہیں رہٹ لگا ہوا تھا اور کھیتوں کو سیراب کرنے والا یہ پانی اسی رہٹ والے کنوئیں کی طرف سے آرہا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اسی جگہ بیٹھا رہا۔ اندھیرا دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تین چار کھیت چھوڑ کر کوئی گاؤں تھا۔ وہاں دو تین جگہوں پر روشنی جھلملانے لگی تھی۔ میں نے مسجد میں رات بسر کرنے کا سوچ لیا تھا۔ میں نے نالے کے پانی سے وضو کیا اور شہید مسجد کے کھنڈر میں آکر دو نفل پڑھے۔ خدا کے حضور اسلام کی سربلندی اور پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگی اور جیکٹ کے بٹن بند کر کے آدھی ٹوٹی چھت کے نیچے محراب کی ایک طرف ہو کر اندھیرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بٹن اس لئے بند کر لئے تھے کہ جیسے جیسے رات ہو رہی تھی سردی بڑھنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چاروں طرف رات کا اندھیرا چھا گیا۔ گاؤں کی جانب سے کسی بھینس کے ڈکرانے کی آواز آرہی تھی۔ جو تھوڑی دیر بعد بند ہو گئی۔ میں وہیں زمین کو صاف کر کے لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ بہت پیدل چلا تھا کچھ دیر بعد ہی مجھے نیند آگئی۔

میں بڑی گہری نیند سو چکا تھا۔ خدا جانے میں کب تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ قریب ہی کوئی شور ہوا تھا جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ شور ایسا لگا تھا جیسے کوئی چیز زمین پر گر پڑی ہو۔ میں جلدی سے اٹھ کر مسجد کی چھت سے باہر نکلنے کے لئے دیوار کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ اس خیال سے میں کونے میں ہو گیا کہ دیکھتا ہوں کون ہے۔ میں ایک کمانڈو کی حیثیت سے پوری طرح ہوشیار ہو چکا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں اندر آنے والے کے سامنے جاؤں میں چاہتا تھا کہ وہ اندر آجائے تاکہ مجھے معلوم ہو کہ وہ کون ہے؟ اگر وہ پولیس کا سپاہی ہوا اور مسلح بھی ہوا تو میں اندھیرے میں تھا اور بڑی آسانی سے پولیس کے آدمی کی گردن توڑ سکتا تھا۔ اس وقت میں بالکل بے

خوفی کی حالت میں تھا۔ قدموں کی آہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی مسجد کے آگے بکھری ہوئی اینٹوں کے درمیان اندھیرے میں بڑی احتیاط سے چل رہا ہے۔ میں اندھیرے کونے میں سانس روکے حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔ جہاں سے مسجد کی چھت آدھی ڈھے چکی تھی اور جہاں دیوار ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں رات کی نیلی نیلی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ایک انسانی ہیولا اس روشنی کے غبار میں مسجد کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

یہ انسانی ہیولا کسی اونچے لمبے آدمی کا نہیں تھا۔ مجھے یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ کوئی عورت تھی۔ اس نے سر پر چادر لی ہوئی تھی۔ اس نے سر پر چادر کو ٹھیک کیا تو مجھے اس کی چوڑیوں کی آواز سنائی دی۔ اب اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ یہ کوئی عورت ہے مگر سوال یہ تھا کہ یہ عورت آدھی رات کو اس ٹوٹی پھوٹی مسجد میں کیا کرنے آئی ہے۔ میں وہیں آہستہ سے اندھیرے کونے میں بیٹھ گیا۔ میں ہولے ہولے سانس لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عورت کو وہاں میری موجودگی کا علم ہو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عورت وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ مسجد کی آدھی چھت ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے عورت کے آس پاس ستاروں کی رات کی ہلکی نیلی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ عورت اندر آچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے جھک کر پاؤں کی جوتیاں اتار کر ایک طرف رکھ دیں اور خود مسجد کی پرانی اور شکستہ محراب کے آگے دوزانو ہو کر اس طرح بیٹھ گئی جس طرح آدمی نماز پڑھتے وقت بیٹھتا ہے۔ اس عورت نے دونوں ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں اٹھا دیئے۔ میں حیرت کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ پاکستان کے قیام کو سترہ اٹھارہ سال گزر چکے تھے اور مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان گھر نہیں تھا۔ یہ عورت مسلمان لگتی تھی۔ پھر یہ مسلمان عورت کہاں سے آگئی تھی۔ مشرقی پنجاب کے اکثر شہروں میں مسلمان بزرگوں کی خانقاہیں اور مزار ہیں جہاں کے مسلمان گدی نشین ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور ان مسلمان بزرگوں کے مزاروں کو ہندوؤں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور وہاں اب ہندو سکھ مرد اور عورتیں آکر

چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور منتیں مانگتی تھیں۔ ان مزاروں پر تو میں نے ہندو سکھ عورتوں
کو جاتے امرتسر جالندھر اور مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں میں دیکھا تھا مگر وہاں جو
مسجدیں باقی رہ گئی تھیں اور ویران پڑی تھیں وہاں کسی ہندو یا سکھ عورتوں کو اس طرح
رات کے وقت جا کر دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا تھا۔

اتنے میں مجھے اس پراسرار عورت کی سسکی بھرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر
آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

"اے اللہ میاں! میری ماتا جی نے مجھے بتایا تھا کہ تو ہم مسلمانوں کا خدا ہے اور جو
تیرے دربار میں آکر فریاد کرے تو اس کی فریاد سنتا ہے۔ اللہ میاں! میں کئی سالوں سے
جب بھی مجھے رات کو موقع ملتا ہے تیرے دربار میں آکر فریاد کرتی ہوں۔ تو میری فریاد
کیوں نہیں سنتا۔ اللہ میاں! میری فریاد سن لے۔ مجھے کسی طرح میرے مسلمان بھائیوں
کے ملک پاکستان پہنچا دے۔ میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ صرف اتنا مانگتی ہوں کہ مجھے
میری ماتا جی میری اماں جی کے دیس پاکستان پہنچا دے۔ میری ماں تو پاکستان کو یاد کرتے
کرتے سورگباش ہو گئیں۔ مجھے ان کافروں میں سے اٹھا کر پاکستان پہنچا دے۔ اللہ میاں
میں تجھے اپنی سورگباشی ماتا جی! اپنی اماں جی کا واسطہ دیتی ہوں مجھے پاکستان پہنچا دے"
اور وہ عورت سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

اس نے خدا کے حضور جو دعا مانگی تھی اس کو سن کر ایک لمحے کے لئے میں سکتے میں
آگیا۔ میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھنے لگا تو پتھر کی جس سل پر میں بیٹھا تھا اس کے ہلنے سے آواز
پیدا ہوئی۔ لڑکی نے چونک کر کونے کی جانب دیکھا۔ میں اسے نظر آگیا اس نے کچھ ڈرے
ہوئے کچھ پراعتماد لہجے میں کہا۔

"کون ہے؟"

میں کونے میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ ڈر کر باہر کو دوڑنے لگی تو میں
نے اس کو کلائی سے پکڑ لیا۔

"ڈرو نہیں بہن۔ میں بھی تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔"

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بت بن کر اندھیرے میں مجھے تکنے لگی۔ میں نے اس کی
کلائی چھوڑ دی۔

"بیٹھ جاؤ میری بہن! میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا
چاہتا ہوں کہ یہاں تو کوئی مسلمان گھر نہیں ہے۔ پھر تم یہاں کہاں سے آگئی ہو؟"

حالانکہ میں ساری بات سمجھ چکا تھا۔ مگر میں اس لڑکی کی زبان سے بھی سننا چاہتا تھا۔
وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی کہنے لگی۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارا ایک مسلمان بھائی ہوں اور پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ اس سے زیادہ میں
تمہیں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہاری والدہ کون تھی؟

اس لڑکی نے مجھے جو اپنی غم انگیز داستان سنائی وہ یہ تھی کہ اس کی والدہ کے ماں
باپ بہن بھائی ضلع جالندھر کی کسی تحصیل کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بنا تو ہندو سکھوں
نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کی والدہ کے ماں باپ بھی مہاجرین کے
ایک قافلے میں شامل ہو کر پاکستان کی طرف پیدل چل پڑے۔ راستے میں ہندو سکھوں کے
ایک جتھے نے حملہ کر دیا۔ سکھوں نے اس لڑکی کی ماں کے بہن بھائیوں اور باپ کو وہیں
شہید کر دیا۔ اس لڑکی کی ماں جوان تھی اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اسے
اٹھا کر لے گئے۔ یہ ساری باتیں اس لڑکی کی ماں نے اسے بتائی تھیں۔ اس سکھ نے لڑکی
کی والدہ سے بیاہ کر کے اسے گھر میں ڈال دیا۔ اس کے بطن سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا
نام سکھ باپ نے ہرنام کور رکھا۔ لیکن اس کی مسلمان ماں نے خفیہ طور پر اس کا نام رضیہ
بیگم رکھ دیا۔ لڑکی نے بتایا کہ اسے یاد ہے وہ چھوٹی سی تھی کہ اس کی والدہ اس کے کان
کے قریب منہ لا کر اسے کلمہ شریف سنایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ "

"تمہارا نام رضیہ بیگم ہے۔ تم مسلمان ماں کی بیٹی ہو۔ تم سکھنی نہیں ہو۔"

لڑکی کہہ رہی تھی۔

"میں چار پانچ سال کی ہوئی تو مجھے گاؤں کے سکول میں بٹھا دیا گیا۔ میرا سکھ باپ مجھے خاص طور پر گوردوارے ساتھ لے جا کر شبد کیرتن سنوایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ تمہارا نام ہرنام کور ہے تم سکھنی ہو شاید اسے شک پڑ گیا تھا کہ میری ماں مجھے اسلامی تعلیم دیتی ہے۔ گھر میں سب سکھ تھے۔ سارا گاؤں سکھوں کا تھا۔ میری سہیلیاں بھی سکھنی تھیں۔ میری کلائی میں لوہے کا کڑا ہوتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے لوہے کا کڑا پہن رکھا ہے۔"

اس نے مجھے اپنا بازو دکھایا۔ اس کے ایک بازو میں لوہے کا کڑا تھا اور دوسری بانہہ میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے میرا سکھ باپ گرنتھ صاحب کے اشلوک بھی یاد کرایا کرتا تھا۔ مگر میری مسلمان ماں میری تعلیم سے غافل نہیں تھی۔ جب میں اور میری ماں گھر میں اکیلی ہوتیں تو وہ مجھے کلمہ شریف پڑھاتی۔ اس نے مجھے نماز بھی سکھا دی تھی ہم ماں بیٹی چھپ کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔ میری ماں نے مجھے سن سنتالیس کا سارا واقعہ سنا دیا تھا۔ میں بڑی ہوئی تو میرے سکھ باپ نے میری منگنی اپنے بھائی کے بیٹے گرنام سنگھ سے کر دی۔ میری ماں اس غم میں گھلنے لگی کہ اس کی بیٹی کا بیاہ بھی ایک سکھ سے ہو جائے گا اور وہ سکھ نسل پیدا کرے گی۔ میری ماں نے ایک روز مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ بیمار تھی اور چارپائی پر کھیس اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کہا۔ بیٹی! میری زندگی کا اب کچھ پتہ نہیں کہ آج مرجاؤں یا کل مرجاؤں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم سکھ سے شادی کر کے سکھوں میں رہو۔ یہاں سے پاکستان زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا تو اب جینا مرنا یہیں ہے۔ مگر تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جس طرح ہو سکے یہاں سے بھاگ کر اسلامی ملک پاکستان پہنچ جاؤ اور مسلمان بن کر زندہ رہو۔ میری ماں اس کے دوسرے روز مرگئی۔ میں اپنی ماں کو قبر میں دفن ہوتے دیکھنا چاہتی تھی مگر اسے چتا میں جلا دیا گیا۔ اس بات کو بھی دو سال ہو گئے ہیں۔ میں نے اس دوران بڑی کوشش کی مگر پاکستان نہ جا سکی۔ میرے سکھ باپ کو مجھ پر شک پڑ گیا تھا کہ میں اندر سے مسلمان ہوں اور پاکستان بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ وہ ہر سال جتھے کے ساتھ ننکانہ صاحب کی یاترا کو پاکستان جاتا ہے۔ مگر مجھے ساتھ نہیں لے جاتا۔ مجھ پر کڑی نگاہ رکھی جاتی

ہے۔ اب میرا سکھ باپ اپنے بھتیجے گرنام سنگھ سے میری بہت جلد شادی کر دینا چاہتا ہے۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اس قید خانے کی سلاخیں توڑ کر پاکستان کی طرف نکل جاؤں گی۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی تو دریا میں ڈوب کر مرجاؤں گی۔"

رضیہ بیگم عرف ہرنام کور چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے پاکستان پہنچا سکتا۔ مگر میں اسے سکھوں کے پاس بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ لڑکی دل سے مسلمان تھی اور اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر وہ پاکستان نہ پہنچ سکی تو خود کشی کر لے گی۔ لڑکی نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اگر تم مسلمان ہو اور تم واقعی مجھے اپنی بہن سمجھتے ہو تو میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ مجھے کسی طرح پاکستان کا بارڈر کراس کرا دو۔ مجھے کسی طرح پاکستان کی سرحد میں داخل کرا دو۔ میں ساری زندگی تمہارے حق میں دعائیں مانگتی رہوں گی میرا ایمان ہے کہ خدا نے میری کئی برسوں کی دعا آج سن لی ہے۔ اسی واسطے اس نے تمہیں یہاں اس ٹوٹی ہوئی مسجد میں بھیجا ہے۔ یہاں میں کبھی کبھی رات کو جب گھر میں سب سکھ مرد عورتیں سو رہی ہوتی ہیں تو خدا کے حضور دعا مانگنے آ جاتی ہوں۔ آج خدا نے میری دعا قبول کر لی ہے۔ خدا کے لئے میری مدد کرو مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور پاکستان پہنچا دو"

میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں خود اس وقت پولیس سے چھپا پھر رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیسے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ مگر میرا دل اسے وہاں چھوڑنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے بھی یقین سا ہونے لگا کہ خدا کی مرضی یہی تھی کہ میں عین اس مسجد میں رات بسر کرنے کے لئے چھپ جاؤں جہاں اس مسلمان لڑکی نے رات کو دعا مانگنے آنا تھا۔ اور اب مجھ پر خدا کی طرف سے یہ ذمے داری عائد ہو گئی تھی کہ اس لڑکی کی مدد کروں جو سکھ کی اولاد تھی مگر مسلمان ماں کی مسلمان بیٹی تھی۔

میں نے کچھ نہ سوچا۔ لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"فکر نہ کرو بہن۔ میں تمہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کروں گا"

لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر مسجد کی شکستہ محراب کے آگے سجدے میں گر کر روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ میں نے باہر کی جانب دیکھا کہ اس لڑکی کے پیچھے اس کے گھر سے کوئی وہاں تو نہیں پہنچ گیا۔ مگر باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم اس وقت میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

لڑکی نے فوراً کہا۔

"ہم خدا کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ مجھے میری مسلمان ماں نے بتایا تھا کہ کوئی مسلمان خدا کے گھر میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیا تم واقعی مسلمان ہو اور مجھے پاکستان لے جاؤ گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ میں واقعی مسلمان ہوں اور تمہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

لڑکی بولی۔

"تو پھر چلو۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلتی ہوں"

میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اس مسلمان لڑکی کو سکھوں کے عذاب سے چھٹکارا دلانا ہی ہے تو پھر کل کا انتظار کیا کرنا۔ اسی وقت اسے بھی ساتھ لے کر چل پڑتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کل کا انتظار کیا تو دن کہاں گزاروں گا؟ کہیں پکڑا ہی نہ جاؤں۔ ارادہ یہی تھا کہ اس لڑکی کو مجاہدین کے پاس پہنچادوں گا وہاں سے اس کے پاکستان پہنچانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے ہوشیار پور کی جانب کونسا راستہ جاتا ہے۔ کیونکہ مجھے جموں کی طرف سے کشمیر جانا ہے۔ وہاں میرے بہت سے مسلمان مجاہد ساتھی ہیں۔ وہ لوگ تمہیں پاکستان پہنچادیں گے۔"

لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اپنے کشمیری بھائیوں کی بہادری کی داستانیں سنتی رہی ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کاش میں مرد ہوتی تو کشمیر میں بھارتی فوج جو ظلم و ستم کر رہی ہے اس کے خلاف مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر لڑتی۔"

پھر اس نے مجھے بتایا کہ ہوشیار پور وہاں سے بہت دور ہے اور ہمیں تین گاؤں چھوڑ کر ایک سڑک پر سے لاری پکڑنی ہوگی۔ لڑکی اس سارے علاقے سے واقف تھی۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اللہ کا نام لے کر میرے ساتھ چل پڑو"

میں اسے ساتھ لے کر مسجد کے کھنڈر سے نکل آیا۔ اس نے چادر اچھی طرح سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دبلی

پتلی تھی مسجد سے باہر نکلتے ہی ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے آہستہ سے بولی۔

"بھائی اس طرف آجاؤ۔ یہ راستہ گاؤں کے باہر والے کھال کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے ہم بڑی جلدی گاؤں سے دور نکل جائیں گے۔"

میرے خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس شکستہ مسجد سے جب میں رات کے اندھیرے میں باہر نکلوں گا تو ایک مسلمان لڑکی میرے ساتھ ہوگی جس کو مجھے سکھوں میں سے نکال کر مسلمان مجاہدین کی حفاظت میں دینا ہوگا۔ ہم رات کے اندھیرے میں ایک کھیت کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ لڑکی آگے آگے تھی۔ کھیت میں سے مڑتے ہوئے اس نے ہاتھ سے دور ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا جہاں گھپ اندھیرے میں ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

"وہ ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں میری ماں فوت ہوئی تھی۔"

اور اس کی آواز بھرا گئی۔ مگر لڑکی بڑی بہادر تھی۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ایک کھال آگیا۔ ہم اس کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ہم کھال کے ساتھ ہی ایک طرف کو مڑے تو دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ لڑکی نے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ یہ مصلیوں کے گاؤں ہیں۔ تم یہاں اجنبی ہو۔ کتے تمہاری بو سونگھ کر بھونکنے لگے ہیں۔ ہم دوسری طرف سے نکل جائیں گے۔"

وہ کھال سے اتر گئی۔ نیچے کھیت شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کتوں کے بھونکنے کی آواز کافی پیچھے رہ گئی۔ کھیت ختم ہو گئے تو درختوں کے ذخیرے شروع ہو گئے۔ لڑکی نے بتایا کہ یہ آموں کے باغ ہیں۔ چونکہ آموں کا موسم نہیں تھا اس لئے باغ ویران پڑے تھے اور وہاں کوئی رکھوالا نہیں تھا۔ ہم بغیر رکے چلتے جا رہے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"سڑک کتنی دور رہ گئی ہے؟"

وہ بولی۔

"ابھی کافی دور ہے۔ تم تھک تو نہیں گئے؟"

میں نے کہا۔

"میں تو نہیں تھکا۔ مجھے تمہارا ڈر ہے کہ کہیں تم نہ تھک جاؤ"

وہ کہنے لگی۔

"میں گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ سخت جان ہوں۔ اتنی جلدی نہیں تھکوں گی۔"

رات کے صحیح وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ ہم ایک نہر پر پہنچ گئے۔ نہر کافی بڑی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"اس طرف ریل کا پل ہے۔ ہم اس پل پر سے نہر پار کر کے دوسری طرف جائیں گے۔"

نہر کے کنارے بڑی ہموار کچی پٹڑی بنی ہوئی تھی۔ کنارے پر دور تک اونچے اونچے درخت دور تک چلے گئے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد ریل کا پل آگیا۔ ہم پل پر لگے ہوئے جنگلے کے بالکل ساتھ ساتھ چل کر دوسری طرف آگئے۔ لڑکی کہنے لگی۔

"یہاں سے گاڑیاں ہوشیارپور امرتسر کو آتی جاتی ہیں۔"

لڑکی آخر عورت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تھک گئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر یہاں تھکان اتار لیتے ہیں۔ ہم کچے راستے سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ اب لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم میرے بڑے سچے مسلمان بھائی ہو۔ لیکن تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ تم کہاں سے آرہے تھے اور رات کے وقت مسجد میں کیوں چھپے ہوئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"بات یہ ہے بہن کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں کشمیری مجاہد ہوں کشمیر کے محاذ پر اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر بھارتی فوجیوں کے خلاف جنگ کر رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے جالندھر آیا تھا۔ واپس جانے لگا تو پولیس کو میرے بارے میں خبر ہو گئی۔ پولیس مجھے گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن میں کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب

ہو گیا۔ رات آئی تو یہاں مسجد میں چھپ گیا کہ رات کے پچھلے پہر آگے چلوں گا۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"میں جلدی سے نکل آئی ہوں۔ میں نے کچھ پیسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے کہ کبھی پاکستان بھاگنا پڑے گا تو کام آئیں گے۔ مگر جلدی میں مجھے اس کا خیال نہیں رہا۔ کیا تمہارے پاس لاری کا کرایہ ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔"

پھر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی کہنے لگی۔

"جلدی جلدی یہاں سے نکل چلو۔ میرا باپ صبح صبح کھیتوں میں پانی لگانے کے لئے اٹھے گا۔ اس نے میری چارپائی خالی دیکھی تو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں بھاگ گئی ہوں۔ وہ گرنام سنگھ اور چوہڑ سنگھ کو لے کر میری تلاش میں یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ بڑے خونی قاتل لوگ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی"

اور ہم نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

یہ لڑکی زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی۔ اور اب اس پر تھکن کے آثار بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ اگرچہ وہ اسے ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی ہم ہوشیار پور کٹھوعہ روڈ پر بھی نہیں پہنچے تھے کہ ہمیں راستے میں ہی صبح ہو گئی۔ جس وقت سورج نکلا تو لڑکی نے رک کر پیچھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی نظر آئی۔ میں بھی رک گیا۔ میں خطرے کے مقام سے کافی دور آ چکا تھا۔ اب آگے کوئی خطرہ پیدا ہو جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ مگر پچھلا خطرہ کافی دور تک ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

میں نے طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کا رنگ صاف

تھا۔ نقش تیکھے تھے اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی ہو گی۔ اس نے ناک کے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے دشمنوں کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہا۔

"اچھی بہن! وقت ضائع نہ کرو اور مجھے آگے دیکھ کر یہ بتاؤ کہ ہوشیار پور کٹھوعہ روڈ یہاں سے کتنی دور ہو گی۔ کیا یہ سڑک رات کو آئے گی۔"

اس نے اپنی نسواری رنگ کی کھیس نما چادر جسم پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ یہ سڑک اس طرف ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ ابھی کتنی دور ہے۔"

دن کی روشنی میں ہمیں کھیت اور دور دور کچھ گاؤں بھی نظر آنے لگے تھے۔ یہ سارا علاقہ زرخیز اور آباد تھا۔ بہت دور کچھ ٹیلوں کے خاکے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم کھیتوں اور جھاڑیوں والی زمین پر جا رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کسان ہل چلاتے اور سبزیاں وغیرہ کاٹتے نظر آ رہے تھے۔ ہم ایک کچے راستے پر آ گئے۔ یہاں پیچھے سے ایک یکہ آ رہا تھا۔ لڑکی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"اس طرف ہو جاؤ۔ کہیں میرا باپو نہ آ رہا ہو۔"

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور ہم کیکروں کے درختوں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے۔ یکے میں عورتیں اور مرد بیٹھے تھے۔ یکہ گزر گیا تو لڑکی نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"کس بات کا؟"

میں نے پوچھا۔

"میرا باپو گرنام اور چوہڑ سنگھ کو لے کر ادھر نہ آ جائے۔ وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ آبھی گئے تو جب تک میں زندہ ہوں وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

لڑکی نے میرے اس دلیرانہ جملے کا ذرا سا بھی اثر نہ لیا۔ اسے لینا بھی نہیں چاہئے تھا۔ کیونکہ ایک نہتا نوجوان تین خونی قاتل پیشہ ور سکھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے بالکل صحیح کہا تھا۔ ہم ایک گاؤں کے قریب سے گزر گئے۔ چھوٹی سی ندی آئی۔ لڑکی رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے پیاس لگی تھی۔ میری جیب میں بھنی ہوئی جوار موجود تھی۔ میں نے ندی کے پاس درختوں کے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رضیہ بی بی فکر نہ کرو۔ تمہارا باپو یہاں نہیں آئے گا۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میرے پاس بھنی ہوئی جوار ہے۔ اسے تھوڑا کھاتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں۔ ذرا آرام کرتے ہیں پھر آگے روانہ ہو جائیں گے۔"

لڑکی بیٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے اصرار پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی سی جوار میں نے کھائی۔ اسے بھی کھانے کو دی نہر کا پانی پیا منہ ہاتھ دھویا اور نہر کا چھوٹا سا پل پار کر کے آگے چل پڑے۔ اب نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ وہاں پہاڑیاں نہیں تھیں۔ زمین کہیں اونچی ہو جاتی تھی اور کہیں کوئی گھاٹی یا کھائی آجاتی تھی۔ کچھ چھوٹے چھوٹے ٹیلے بہت فاصلے پر ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں کی زمین بھی نیم پتھریلی تھی۔ کہیں کھیتیاں آجاتیں اور کہیں سنگلاخ زمین شروع ہو جاتی۔ کیکر اور پھلاہی کے درخت زیادہ تھے۔ کہیں کہیں ٹاہلی کے درخت بھی تھے۔ ہم ایک برساتی نالے کے پاس پہنچے تو مجھے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ یہ آواز سن کر لڑکی نے پیچھے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"باپو آگیا"

میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے تین گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہماری طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ لڑکی کا تو رنگ اڑ گیا۔ ایسے لگا جیسے اس کے جسم میں

جان نہیں رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ گھوڑ سوار بڑی تیز آرہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں لڑکی کو اٹھا کر کھائی میں اتار کر لے جاتا گھوڑ سوار ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ یہ تین سکھ تھے۔ ان میں ایک نوجوان تھا۔ دو ادھیڑ عمر کے تھے۔

وہ تیزی سے گھوڑوں پر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے اترے اور ہماری طرف بڑھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر سکھ کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر گرج دار آواز میں کہا۔

"ہرناموا پتر تو ادھر آجا"

لڑکی ایک دم پھٹ پڑی۔ چیخ کر بولی۔

"میں تیری دھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں تو سکھ ہے۔ تو میری ماں کو اٹھا کر لایا تھا۔ میں تیری بیٹی نہیں ہوں"۔

دوسرے جو دو سکھ تھے وہ میرے دائیں بائیں چار پانچ قدموں کے فاصلے پر تلوار لئے کھڑے تھے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے جو نوجوان سکھ تھا اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہرناموا تو میری منگ ہے۔ تو ایک غیر آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے۔ تو نے ہماری عزت ڈبو دی ہے۔"

لڑکی کے باپ نے نوجوان سکھ کو چپ کراتے ہوئے کہا۔

"تو چپ کر گرنام سنگھا! پہلے مجھے اپنی دھی سے بات کرنے دے"

اب میں نے ان سے کہا۔

"میں کسی کو بھگا کر نہیں لے جا رہا۔ لڑکی خود پاکستان جانا چاہتی ہے۔"

اس پر لڑکی کے باپ نے بھڑک ماری اور مجھے گالی دے کر کہا۔

"اوئے میں دیکھتا ہوں تم کس طرح لے جاتے ہو میری دھی کو پاکستان"

پھر اس نے دونوں سکھوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گرنام سیاں چوہڑ سیاں! منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ختم کر دو اس ملیچھ کو یہ مجھے مسلمان

لگتا ہے۔"

اس دوران میں نے اپنے حساب سے ساری منصوبہ بندی کرلی تھی کہ حملے کی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ان سکھوں سے مجھے کسی رو رعایت کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ایسی باتوں پر پنجاب کے دیہات میں عام قتل ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ لڑکی کو شاید کچھ نہ کہیں مگر مجھے ضرور قتل کردیں گے۔ چنانچہ میں ان حالات میں جیسی منصوبہ بندی کرسکتا تھا وہ میں نے ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے کرلی تھی۔ بس تلوار کے پہلے وار سے مجھے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ اس کے بعد ان میں سے کوئی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ لڑکی کے باپو کے منہ سے جیسے ہی یہ جملہ نکلا کہ "منہ کیا دیکھ رہے ہو ختم کردو اس ملیچھ کو" میرے دائیں بائیں کھڑے دونوں سکھوں نے وحشی آدمیوں کی طرح منہ اوپر کرکے بھڑک ماری۔ مجھے اتنی ہی مہلت چاہیے تھی۔ اس نے بھڑک ماری تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ پنجابی میں ہم اسے ہلارا مارنا کہتے ہیں۔ دیہات میں دشمن پر وار کرتے ہوئے ایسا ہی ہلارا مارا جاتا ہے۔ میری بائیں جانب ہٹا کٹا سکھ چوہڑ سنگھ کھڑا تھا۔ اس کا تلوار والا ہاتھ نیچے ہی تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ الٹا کرکے منہ کے آگے رکھ کر زور سے ہلارا مارا تھا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ جس دشمن پر وار کرنے کے لئے ہلارا مار رہا ہے وہ کون ہے۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کر منہ اوپر کو کیا میں چیتے کی طرح اچھلا اور میں نے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ میرے ہاتھ کی ضرب اس کی کلائی پر پڑی تھی۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ ذرا سا خطرہ مول لینے کا بھی وقت نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ چوہڑ سنگھ سنبھلتا میری تلوار اس کے پیٹ میں آدھی سے زیادہ گھس چکی تھی۔ یہ سارا عمل ایک سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سیکنڈ میں مکمل ہوگیا تھا۔ چوہڑ سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے تلوار اس کے پیٹ میں سے کھینچ لی تھی۔ لڑکی کا باپو اور اس کا منگیتر گرنام سنگھ مجھ پر جھپٹے مجھے گرنام سنگھ سے خطرہ تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی

دوسرے سکھ کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ اس کی مجھے فکر نہیں تھی۔ گرنام سنگھ بھی اناڑی تھا۔ اسے تلوار چلانی تو آتی تھی مگر تلوار کے وار سے اپنے آپ کو بچانا نہیں آتا تھا۔ اس احمق نے دونوں ہاتھوں سے تلوار کے دستے کو پکڑا اور اسے اوپر اٹھا کر میرے سر پر وار کرنے کی کوشش کی مگر ابھی اس کی تلوار اسی کے سر کے اوپر ہی تھی کہ میری تلوار اس کے پیٹ کے آر پار ہو چکی تھی۔

میں نے چلا کر لڑکی کے سکھ باپو سے کہا۔

"میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر تم بھی مجھے قتل کرنے کی کوشش کروگے تو مارے جاؤ گے۔"

مگر لڑکی کا باپو ایک تو سکھ تھا دوسرے یہ اس کی عزت آبرو کا معاملہ تھا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔ اس نے ایسی چیخ اپنے حلق سے نکالی کہ ایک بار تو میں بھی گھبرا گیا۔ اس نے مجھے بڑی گندی گالی دی اور گرنام سنگھ کی تلوار پکڑ کر مجھ پر حملہ کردیا۔ اب ہم دونوں میں تلواریں چلنے لگیں۔ میں بھی کوئی تلوار باز نہیں تھا۔ مگر مجھے کمانڈوز کے داؤ پیچ سارے آتے تھے۔ سکھ وحشیوں کی طرح منہ سے غضبناک آوازیں نکالتا ہوا مجھ پر دھڑا دھڑ وار کر رہا تھا۔ مجھے اس کے وار بچانے مشکل ہو رہے تھے۔ مجھے بہت جلد احساس ہوگیا کہ میں تلوار سے اس کے وار زیادہ دیر تک نہ روک سکوں گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کی تلوار کا وار مجھے شدید زخمی کردے۔ کیونکہ سکھ بپھرا ہوا تھا۔ وہ غیرت کے جوش میں تھا اور میں عقل سے کام لے رہا تھا۔ غیرت کے سامنے میری عقل میرا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے بس اتنا ہی کیا کہ سکھ نے تلوار کا وار کیا تو اس کے وار کو اپنی تلوار پر روکنے کی بجائے میں بجلی کی طرح نیچے سے نکل کر اس کی دائیں جانب آگیا اور وہاں آتے ہی میں نے اپنا بایاں بازو اس کی گردن میں ڈال کر اپنے فولادی شکنجے میں لیا اور صرف اتنا جھٹکا دیا کہ وہ بے ہوش ہوجائے۔ نہ جانے کیوں میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن سے نکالا تو وہ نیچے گر پڑا۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے پاؤں کے بل بیٹھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں

منہ میں دبائے کانپ رہی تھی۔ اور منہ سے عجیب قسم کی سہمی ہوئی آوازیں نکال رہی تھیں۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہوش کرو۔ ہوش میں آؤ"

میں نے اسے دو تین جھٹکے دیئے اور گھوڑوں کی طرف دیکھا جو اس قتل کے مناظر سے بالکل بے تعلق ہو کر قریب ہی جھاڑیوں میں منہ مار رہے تھے۔ میں لڑکی کو کھینچتا ہوا گھوڑوں کے پاس لے آیا۔ میں خود ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اور لڑکی سے کہا اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو دوسرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔

لڑکی اپنے ہوش وحواس میں آگئی تھی۔ جلدی سے اس نے گھوڑے کی کاٹھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اچھل کر اس پر بیٹھ گئی۔ دوسرے لمحے ہمارے گھوڑے ہوشیار پور کٹھوعہ کی ترائی کے نیم پہاڑی علاقے میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

مجھ سے دو آدمی قتل بھی ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں نے سیلف ڈیفنس یعنی اپنی جان بچانے کے لئے انہیں قتل کیا تھا۔ مگر مجھے دشمن ملک میں قانون کا تحفظ کیسے مل سکتا تھا۔ مجھ پر تو قتل کا جرم ہی عائد ہوتا اور پھانسی کی سزا ہو جاتی۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں اور میں لڑکی کو لے کر جتنی جلدی ہو سکے سری نگر کمانڈر شیروان کی کیمپ گاہ میں پہنچنا چاہتا تھا۔ گھوڑے کافی تیز دوڑ رہے تھے۔ فاصلہ تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ ہم ایک پکی سڑک پر آگئے۔

لڑکی نے کہا۔

"یہاں سے ہمیں ہوشیار پور کی لاری مل جائے گی۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہی سڑک ہوشیار پور کو جاتی ہے؟"

اس نے کہا۔

"ہاں میں کئی بار یہاں سے لاری میں بیٹھ کر ہوشیار پور گئی ہوں"

ہم نے گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے اور سڑک پر کافی آگے جا کر بیٹھ گئے اور پیچھے سے

آنے والی لاری کا انتظار کرنے لگے۔ دور سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے ہاتھ دیا۔ لاری رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ لاری جموں جا رہی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور لاری میں بیٹھ گیا۔ کٹھوعہ لاری رکی تو میں نے لڑکی سے کہا۔

"ہرنام کور! کچھ کھانے کو لاؤں؟"

یہ جملہ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا تھا کہ دوسرے ہندو سکھ مسافر جو لاری میں ہمارے قریب بیٹھے تھے انہیں یقین ہو جائے کہ ہم بھی ہندو سکھ ہی ہیں۔ لڑکی سمجھ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"نہیں ویر جی!"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ لاری سے نیچے نہ اتروں۔ تھوڑی دیر تک اڈے پر رکنے کے بعد لاری جموں کی طرف چل پڑی۔ یہ سارا علاقہ پہاڑی بھی تھا اور کہیں کہیں میدان بھی آجاتے تھے۔ سردی زیادہ نہیں تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لاری آہستہ آہستہ چل رہی تھی جس کی وجہ سے جب ہم جموں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔

جموں کا شہر میرے لئے جالندھر سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہاں مجھے محتاط رہنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ کشمیر کی جنگ کی وجہ سے یہاں سی آئی ڈی بہت پھر رہی تھی۔ میں نے لاری اڈے سے ہی معلوم کر لیا کہ سری نگر جانے والی لاری اب صبح کے چار بجے چلے گی۔ شام کو سری نگر کوئی لاری نہیں جاتی تھی۔ اب میرے سامنے رات گزارنے کا مسئلہ تھا۔ جموں میں اپنا ایک مجاہد ضرور عام شہری کے بھیس میں موجود تھا مگر میں لڑکی کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اتنے پیسے میرے پاس تھے کہ ہم کسی ہوٹل میں رات بسر کر سکتے تھے۔ لیکن ہوٹل میں رات بسر کرنے سے ہم سی آئی ڈی والوں کی نظر میں آسکتے تھے۔ جموں کے ہوٹلوں کے باہر تو سی آئی ڈی تو ضرور موجود ہوتی تھی۔ بلکہ ہوٹل والے خود سی آئی ڈی والوں کو بتا دیتے تھے کہ رات ٹھہرنے کے لئے ان کے ہوٹل میں کون کون آیا ہے۔ ہم لاری اڈے کی چھت کے نیچے ایک طرف ہو کر بیٹھے تھے۔ لڑکی

نے چادر سے جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

لاری اڈے کے اندر ہی ایک دکان تھی۔ جس کے باہر کانگڑا ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سے دو تین روٹیاں اور چاول بھاجی لی اور لڑکی کے پاس آگیا۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وہ کہنے لگی۔

"رات کہاں رہیں گے ویرا؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا"

لاری اڈے میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ پہاڑی علاقے میں شام جلدی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ذرا اندھیرا ہو جائے تو لڑکی کو لے کر کسی دور افتادہ معمولی سے ہوٹل کی تلاش میں نکلوں جموں شہر کے بازاروں سے میں تھوڑا بہت واقف ہو چکا تھا۔ مگر یہاں بھی وہی خطرہ لاحق تھا کہ یہ بڑا شہر ہے اور کشمیر کی وادی کے قریب ہے۔ یہاں انڈیا کے سبھی اخبار آتے ہوں گے اور وہ اخبار بھی لوگوں نے دیکھے ہوں گے جن میں میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اسی واسطے میں بے حد احتیاط سے کام لے رہا تھا اور لوگوں کی نظروں سے اپنے چہرے کو چھپا رہا تھا۔ شام ہو گئی تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ اب میں لاری اڈے سے باہر نکل سکتا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم کس ہوٹل میں جائیں۔ ہوٹل کے سوا دوسری کوئی ایسی جگہ ذہن میں نہیں آرہی تھی جہاں میں لڑکی کے ساتھ رات گزار سکوں۔

اچانک میرے ذہن میں گوردوارے کا خیال آگیا۔ جموں شہر میں بڑے مندر گوردوارے تھے۔ ہم کسی گوردوارے میں محفوظ رہ کر رات گزار سکتے تھے۔ ایک زمانے میں میں نے جموں شہر کے باہر ایک بستی میں ایک گوردوارہ دیکھا تھا۔ میں نے وہیں چلنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس بستی کا نام یاد نہیں رہا جس بستی میں یہ گوردوارہ تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"ہم کسی گوردوارے میں رات گزاریں گے۔ ہوٹل میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں پولیس ہمارے پیچھے آسکتی ہے۔ مجھ سے دو خون بھی ہو چکے ہیں۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی بھائی جان!"

لڑکی کبھی مجھے ویرجی کہتی اور کبھی بھائی جان کہتی۔ وہ سکھوں کے ماحول میں پلی بڑھی تھی مگر اس کو مسلمان ماں نے پالا تھا اور اس کو کلمہ پڑھایا تھا۔ نماز سکھائی تھی اور مسلمانوں کے تمدن سے بھی روشناس کردیا تھا۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی بالکل مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح مجھے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

ہم لاری اڈے سے نکل کر بڑی سڑک پر آکر کھڑے ہوگئے۔ ایک خالی تانگہ قریب ہی کھڑا تھا۔ اس وقت مجھے جموں کی اس بستی کا نام معلوم تھا جہاں گوردوارہ تھا۔ یہ بستی شہر کے مضافات میں تھی۔ اسی لئے میں نے اس بستی کے گوردوارے کو منتخب کیا تھا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگہ اس مضافاتی بستی کی طرف چل پڑا۔ میں اور لڑکی تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جموں شہر کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ تانگہ ایک گھاٹی اتر کر ایک ٹیلے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی ٹیلے کے دامن میں گوردوارہ تھا۔ ٹیلے کی ڈھلان پر اور نیچے مکانات تھے جہاں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے تانگہ گوردوارے سے کچھ فاصلے پر رکوا دیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"میں بات کروں گا۔ تم خاموش رہنا"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ گوردوارے کے دروازے پر بلب جل رہا تھا۔ اندر سے گوربانی کی آواز آرہی تھی۔ سکھ مرد عورتیں گرنتھ صاحب کے درشنوں کو گوردوارے میں جا رہے تھے۔ ہم گوردوارے کے اندر جا کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا تو میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو میں گرنتھی سے بات کر کے آتا ہوں۔"

میں گوردوارے کے اس کمرے میں آگیا جہاں گوربانی کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ میں نے سر

پر رومال باندھ لیا تھا۔ یہ گوردوارے کے احترام کے لئے ضروری تھا۔ میں نے دیکھا کہ گرنتھی اس وقت بے حد مصروف تھا۔ اس سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر وہاں احترام سے بیٹھے رہنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ ایک طرف ایک نیلے کپڑوں والا اکالی سیوادار لمبے جھاڑو سے گوردوارے کا صحن صاف کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر ست سری اکال کہا اور اس سے پوچھا کہ وہاں پردیسی مسافروں کے رات بسر کرنے کو کوئی جگہ مل جائے گی۔ سیوادار نے کہا۔

"گوردوارے کے پیچھے سرائے ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔"

میں لڑکی کو لے کر سرائے میں آگیا۔ یہ سرائے ایک لمبی سی بارک کی شکل کی تھی۔ بارک کے برآمدے میں کچھ عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ یہاں بھی ایک سیوادار مل گیا میں نے اسے کہا۔

"صاحب جی! میرا نام شام سنگھ ہے۔ میرے ساتھ میری بہن بھی ہے۔ ہم سری نگر جا رہے تھے کہ معلوم ہوا لاری صبح کو جائے گی۔ ہمیں رات گزارنے کو کمرہ مل جائے گا؟"

دس روپے ادا کرنے پر ہمیں ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا۔ جس میں ایک چارپائی تھی۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ہمیں دو موٹے کمبل بھی مل گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم چارپائی پر سو جانا۔ میں دری پر سو جاؤں گا"

لڑکی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نیچے دری پر کمبل گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں رات کو خاصی سردی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں اپنے باپو کے مرنے کا افسوس نہیں ہے؟"

وہ بولی۔

"وہ میرا باپو نہیں تھا۔ وہ میرا اور میری ماں کا دشمن تھا۔ اس نے میری ماں کے بہن بھائیوں ماں باپ کو شہید کر کے اس کو اغوا کیا تھا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا۔ میں اسے اپنا باپ نہیں سمجھتی مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے۔"

میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں نے اس کے باپ کی گردن کو صرف اتنا جھٹکا دیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستانی فوجی ہو؟"

میں نے کہا۔

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

وہ بولی۔

"جس طرح تم نے اکیلے اور نہتے ہو کر تین تلواروں کرپانوں والے سکھوں کو ٹھکانے لگایا ہے یہ پاکستان کا بہادر فوجی ہی کر سکتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پاکستان کا ہر مسلمان فوجی ہے اور وہ اپنے ملک پر حملہ کرنے والے دشمن کو اسی طرح ٹھکانے لگائے گا"

کھانا ہم نے لاری اڈے پر ہی کھا لیا تھا۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد لڑکی چارپائی پر اور میں دری پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ کمرے میں کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ سرائے کے سیوادار نے کمرہ دیتے وقت مجھے دو باتوں کی خاص طور پر ہدایت کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"رات کو کمرے کا بلب جلتا رکھا جائے گا۔ تم لوگوں نے منہ اندھیرے سری نگر جانے والی لاری پکڑنی ہے۔ اس وقت میں گوربانی پاٹھ سن رہا ہوں گا تم کمرے کو تالا لگا کر چابی یہاں سے صندوقچی میں ڈال جانا۔"

میں نے کمرے کا تالا اس میں لگی ہوئی چابی سمیت اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر چارپائی پر لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دستک کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر دروازے کے پاس آگیا۔

"کون ہے بھئی؟"

میں نے پوچھا۔

باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"سنگتو! پرشاد لے لو"

پرشاد کا معاملہ تھا۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گوردوارے کا کوئی سیوادار ہو گا جو سرائے کے مسافروں میں گوردوارے کا پرشاد بانٹ رہا ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک درمیانے قد کا بھاری بدن والا آدمی ہاتھ میں حلوے کا ڈونا لئے کھڑا تھا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے اندر آ گیا اور لڑکی کو پرنام کرتے ہوئے بولا۔

"شما کر دینا بہن جی! آپ کو تکلیف دی ہم نے ایک سکھیا سکھی تھی یہ اس کا پرشاد ہے۔"

میں نے پرشاد کا ڈونا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔

"شکریہ ماراج۔ ہم بڑے تھکے ہوئے ہیں"۔

میرا مطلب تھا کہ ہم سونا چاہتے ہیں اور تم چلے جاؤ۔ مگر وہ کھڑا رہا اور میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ باریک تھے اوپر مونچھوں کا چھجہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بڑی خطرناک لگی۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب آپ جالندھر سے آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں جی! میرا نام شام سنگھ ہے یہ میری بہن ہرنام کور ہے۔"

اس وقت جلدی میں میرے منہ سے لڑکی کا اصلی نام نکل گیا جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پھر اپنی گرم صدری میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ کہنے لگا۔

"میں جموں پولیس کا سی آئی ڈی انسپکٹر بنسی دھر ہوں۔ تمہارے بارے میں ہمیں ساری رپورٹ مل چکی ہے۔ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ پیچھے دو سکھوں کا خون کر کے آرہے

ہو۔ اور اس عورت کو بھگا کر سری نگر لے جا رہے ہو۔ یہ عورت اس کمرے میں رہے گی۔ تم کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔"

میں نے اپنے آپ کو بالکل پریشان نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ واقعہ مجھے پہلی بار پیش نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے میں کئی بار اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ باہر پولیس تو نہیں آئی۔ میں نے کہا۔

"مہاراج آپ کو غلطی لگ گئی ہے۔ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ پاکستانی جاسوس سرائے کے کسی دوسرے کمرے میں ہی ہو گا۔ میں ضلع جالندھر کے گاؤں بیروالی کا رہنے والا ہوں اور یہ میری بہن ہے۔"

اس آدمی کا چہرہ مزید کرخت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پستول پر اس کے ہاتھ کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی اور اس کا رخ میرے سینے کی جانب تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے مخبر گدھے نہیں ہیں۔ تھانے چل کر تم خود مان جاؤ گے کہ تم ہی پاکستانی جاسوس ہو اور تم نے دو سکھوں کو قتل کیا ہے اور ایک سکھ سردار کو بے ہوش کر کے اس کی بیٹی ہرنام کور کو اغوا کر کے لے جا رہے ہو"

میں نے ہرنام کور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آپ ہرنام کور سے پوچھ لو اگر میں اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہوتا تو وہ شور نہ مچاتی۔"

سی آئی ڈی انسپکٹر اس کے جواب میں ایک ایسی حرکت کر بیٹھا جو پولیس اور سی آئی ڈی کے لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ پستول اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور وہ مجھ سے دو قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بڑی غلیظ گالی دیتے ہوئے ایک دم بائیں ہاتھ سے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔ کمانڈو اور ایک میرے ایسا تربیت یافتہ کمانڈو بڑا متحمل مزاج ہوتا ہے۔ اور کبھی گرمی نہیں کھاتا۔ وہ ہر قدم ٹھنڈے دل سے پوری طرح سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے مگر خدا جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ گالی سنتے اور تھپڑ کھاتے ہی میرا سر پھر گیا۔ شاید اس کی وجہ وہ لڑکی بھی ہو جس پر پہلے ہی سے میری دلیری کی دھاک

بیٹھ چکی تھی اور جو چارپائی پر حیران پریشان بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند گئی۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کیسے اس کی ناف کے نیچے زور سے اپنا ٹھڈا مارا اور کیسے وہ دہرا ہو کر گر پڑا۔ پھر کیسے میں نے سب سے پہلے اس کا پستول پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینکا اور کب میرے فولادی بازو نے اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب بنسی دھر نامی جموں پولیس کا سی آئی ڈی انسپکٹر میرے قریب ہی دری پر مرا ہوا پڑا تھا۔ میں نے پستول اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالا اور کھونٹی سے جیکٹ اتار کر پہنتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی چلنا ہوگا۔"

لڑکی جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور سرہانے کے پاس پڑی چادر جسم پر لپیٹنے لگی۔ میں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے کنجی لگا ہوا تالا نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور لڑکی کو ایک سیکنڈ رکنے کا اشارہ کیا۔ دروازہ اگرچہ بند تھا مگر اسے اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ آدمی اپنے ساتھ باوردی یا سویلین کپڑوں والی پولیس کے آدمی تو نہیں لایا۔ برآمدے کا بلب کونے میں جل رہا تھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ گوردوارے کے بڑے کمرے کی جانب سے گوربانی کے پاٹھ کی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ جو راستہ برآمدے سے گوردوارے کے گیٹ کی طرف جاتا تھا رات ہو جانے اور سردی بڑھ جانے کی وجہ سے وہ بھی خالی پڑا تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

"آجاؤ"

لڑکی چھ سات گھنٹوں میں میرے ہاتھ سے تین چار آدمی قتل ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ وہ چادر اپنے جسم پر ٹھیک کرنے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے نکل چلو"

کمرے سے باہر آ کر میں نے دروازے کو تالا لگایا اور چابی اپنی جیب میں ہی رکھ لی۔ تاکہ اگر سیوادار نے صبح کے وقت کمرے کو کھول کر لاش دیکھنی ہے تو اسے مزید دیر لگ

جائے۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ تو تھا نہیں۔ تین کپڑوں میں تھے۔ اسی طرح بڑے سکون سے چلتے ہوئے برآمدے سے اتر کر گوردوارے کے گیٹ میں سے باہر نکل گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سی آئی ڈی انسپکٹر معاملے کی تحقیقات کے لئے اکیلا ہی آیا تھا۔ ایسے موقعوں پر یہ لوگ اکیلے ہی جاتے ہیں مگر سنگین حالات میں اسلحہ ضرور ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ کامیاب کارروائی پولیس کی بجائے اپنے نام ڈالنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور یقین کریں اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو سی آئی ڈی انسپکٹر اسے تھانے لے گیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے پڑ گیا ہے۔

جموں شہر کی اس بستی کی سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ دریا پار شہر کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ لڑکی کہنے لگی۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں ویر جی؟"

یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"اب ہمارا اس شہر میں رکنا ٹھیک نہیں ہمیں یہاں سے کسی طرف نکل جانا چاہئے"

"ہم آگے پہاڑیوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں"

لڑکی نے کمانڈو عورتوں والی بات کی تھی۔ میں نے کہا۔

"صبح پولیس کو گوردوارے میں اپنے انسپکٹر کی لاش مل جائے گی اور جموں سے لے کر سری نگر تک پولیس سڑک کی ناکہ بندی کر لے گی۔ وہ آس پاس کی پہاڑیوں میں بھی ضرور جائے گی۔"

"تو کیا پھر ہم واپس کٹھوعہ چلے جائیں؟"

میرا ذہن بڑی تیزی سے کوئی ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت سری نگر کی طرف کوئی لاری یا ٹرین بھی نہیں جاتی تھی۔ اگر جاتی بھی تو راستے میں ہم پکڑے جا سکتے تھے۔ میں لڑکی کی تجویز پر غور کرنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم پہاڑیوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ یہ تجویز مجھے محفوظ محسوس ہو رہی تھی۔ اگر ہم جموں سے آگے نکل کر آس

پاس کے ویرانے علاقے میں کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔ اور وہاں ایک رات اور ایک دن گزار لیتے ہیں تو دوسرے دن کسی لاری یا ٹرک کے ذریعے جموں سے سری نگر تک جانے میں اتنا زیادہ خطرہ نہیں ہوگا۔

جموں شہر کے شمال مغرب کی طرف جو خشک کہیں کہیں جنگلی جھاڑیوں والی پہاڑیاں تھیں وہ میری جانی پہچانی تھیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار میں بھارتی دہشت گردوں کو ٹھکانے لگانے کے آپریشن کے سلسلے میں ان پہاڑیوں میں دور پاکستانی سرحد کے قریب تک جا چکا تھا اور وہاں ان بھارتی تخریب کاروں کو گولیوں سے بھون کر واپس آگیا تھا جو پاکستان میں جا کر دہشت گردی کرنے والے تھے۔ اگرچہ صحیح طور پر مجھے ان پہاڑیوں کا حدود اربعہ یاد نہیں تھا مگر اتنا مجھے معلوم تھا کہ ان پہاڑیوں میں بے شمار قدرتی غار گھاٹیاں برساتی نالے اور کھڈ ہیں جہاں ہم جب تک چاہیں بغیر کسی خطرے کے روپوش رہ سکتے تھے۔ اس وقت مجھے کسی جگہ کچھ دیر کے لئے روپوش ہونے کی سخت ضرورت تھی۔ ورنہ جموں اور سری نگر کے راستے میں میرا اور لڑکی کا پولیس کے قابو میں آجانا یقینی تھا۔ میرے ساتھ تو پولیس نے جو سلوک کرنا تھا اس کا مجھے علم تھا مگر اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو جاتی۔ وہ پھر نہ پاکستان جا سکتی تھی اور نہ واپس اپنے گھر میں جا سکتی تھی۔

اس لڑکی کو پاکستان پہنچانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی بدنصیب مسلمان ماں نے اسے پکا مسلمان بنا دیا تھا اور اس کے دل میں اسلام سے اور پاکستان سے اتنی شدید محبت پیدا ہو چکی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ پاکستان نہ پہنچ سکی تو واقعی خودکشی کر لے گی۔ ہمیں ایک خالی رکشا مل گیا۔ یہ موٹر رکشا تھا اور جموں میں یہ رکشے نئے نئے چلنا شروع ہوئے تھے۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میں نے ڈرائیور سے ایک خاص جگہ کا نام لے کر کہا کہ ادھر چلو۔ رکشا چل پڑا۔ جس خاص جگہ کا میں نے نام لیا تھا وہ جموں شہر کے شمال میں جموں سری نگر روڈ پر دریا کے پار واقع تھی۔ یہاں ایک بہت بڑا برساتی نالے کا پل بنا ہوا تھا۔ اس پل پر آکر ہم رکشے سے اتر گئے۔ رات کا اندھیرا یہاں زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ آس پاس کوئی بجلی کا کھمبا نہیں تھا۔ پھر بھی چونکہ آسمان صاف تھا اور تارے

چمک رہے تھے اس لئے ان کی دھندلی دھندلی چمک میں زمین اور کہیں کہیں درختوں کے ہیولے ضرور نظر آرہے تھے۔ جب رکشا ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا تو لڑکی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں نے تمہاری تجویز پر عمل کیا ہے ہم ایک رات اور ایک دن یہاں سے دور جو پہاڑیاں نظر آرہی ہیں وہاں چھپے رہیں گے۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی پولیس کو سی آئی ڈی انسپکٹر کی لاش مل جائے گی اور وہ کم از کم جموں سری نگر روڈ پر ضرور چیکنگ شروع کر دے گی۔"

میں نے اسے یہ بالکل نہ بتایا کہ اخباروں میں میری تصویر بھی چھپ چکی ہے اور پولیس پہلے ہی سے میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ لڑکی دلیر تھی۔ کہنے لگی۔

"تم مجھے جہاں لے چلو گے میں چلی جاؤں گی۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے پاکستان ضرور پہنچا دینا۔ مرنے کے بعد میری روح بھی تمہیں دعائیں دیتی رہے گی۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمک گیا۔ اس لڑکی کو اگر پاکستان ہی پہنچانا ہے تو مجھے سری نگر جا کر اس کو مجاہدین کے ذریعے بارڈر کراس کرانے کی بجائے اسے یہاں جموں کی پہاڑیوں سے بارڈر کراس کرا کے پاکستان لے جا سکتا ہوں۔ اگرچہ میں ایسا غیر قانونی اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ ایک مسلمان لڑکی کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

اس خیال کے ساتھ ہی جیسے میرا آدھا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ بجائے پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے میں ان پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر پاکستان کے بارڈر تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد میرا وہ فرض پورا ہو جائے گا جو مجھ پر اس لڑکی کی طرف سے عائد ہوتا ہے اور جس کی اس لڑکی کی بدنصیب مغویہ مسلمان ماں نے اس کو قسم دلائی تھی۔ میں نے لڑکی کو اپنا فیصلہ نہ بتایا اور اس کو ساتھ لے کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ دور نظر آنے والی پہاڑیوں کے ہیولوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

نالے کی دیوار اونچی تھی اور اس میں پانی نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی ایک میل تک

نالے پر چلنے کے بعد چھوٹے چھوٹے چھتری نما درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ تھک تو نہیں گئی۔ لڑکی نے کہا۔

"بالکل نہیں تھکی بھائی جان"

جب وہ مجھے بھائی جان کہتی تو مجھے اچھی بھی لگتی اور مجھے اپنی شہید بہن کلثوم یاد آجاتی اور میرے اندر یہ جذبہ زیادہ شدت اختیار کرلیتا کہ مجھے اس لڑکی کو پاکستان ضرور پہنچانا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم پاکستان تو جا رہی ہو مگر وہاں تمہارا کون ہے جس کے پاس جاؤ گی؟"

یہ سوال میرے ذہن میں کئی بار پیدا ہوا تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔

"میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان میں گجرات شہر کے قریب ایک گاؤں ہے۔"

لڑکی نے مجھے گاؤں کا نام بتایا جو میں یہاں قصداً نہیں لکھ رہا۔

"ماں نے کہا تھا کہ اس گاؤں میں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ تم پاکستان پہنچ کر سیدھے ان کے پاس چلی جانا۔ وہ لوگ تمہیں اپنے پاس رکھ لیں گے اور تمہاری اپنے عزیزوں میں شادی کر دیں گے۔"

لڑکی نے مجھے اپنی والدہ کے رشتے داروں کے نام بھی بتائے۔ میں سوچنے لگا کیا وہ لوگ اس لڑکی کو قبول کرلیں گے؟ یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیں۔ ایسی صورت میں لڑکی کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گی؟

رات گہری ہو گئی تھی۔ ہم جموں شہر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ جموں شہر کی روشنیاں اب پیچھے دیکھنے سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ میدان ختم ہوا تو اونچا نیچا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹیلے ٹبے تھے جن پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی تھک گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں رک گیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔"

لڑکی بیٹھ گئی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر کا پستول میری جیب میں تھا۔ قریب ہی ایک ٹیلہ تھا میں نے لڑکی سے کہا۔

"وہاں چل کر کوئی جگہ دیکھتے ہیں"

ٹیلے کے دامن میں جھاڑیاں نہیں اگی ہوئی تھیں۔ ان کی بجائے وہاں بڑی بڑی پتھریلی سلیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ چلنے سے سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ مگر ان سلوں پر کچھ دیر بیٹھنے سے سردی محسوس ہونے لگی۔ شبنم بھی گر رہی تھی۔ مجھے لڑکی کا زیادہ خیال تھا۔ میں تو سرد گرم کا عادی تھا۔ میں اٹھ کر ٹیلے کے پیچھے گیا تو وہاں درختوں کے نیچے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ خدا جانے یہ کس مقصد کے لئے اس ویرانے میں بنایا گیا تھا۔ میں نے لڑکی کو وہاں بلایا اور کہا۔

"اس سے اچھی جگہ یہاں نہیں مل سکتی یہیں سو جاتے ہیں"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور چبوترے کے فرش پر اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ کر لیٹ گئی۔ میں دوسری طرف بازو کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔ لڑکی بے حد تھکی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی۔ وہ سو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ لیکن مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر میں بھی سو گیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو درختوں میں سے دھوپ چھن چھن کر میرے اوپر آ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ لڑکی اسی طرح چادر لپیٹے سو رہی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا یہ علاقہ میدانی بھی تھا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ ٹیلوں پر زیادہ درخت نہیں تھے۔ میں چبوترے سے اتر کر کچھ دور گیا تو مجھے ایک چھوٹی سی نہر بہتی نظر آئی۔ اس کا پانی پنجاب کے میدانی علاقوں کی نہروں ایسا گدلا نہیں تھا بلکہ صاف تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور واپس چبوترے پر آیا تو لڑکی جاگ چکی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"یہاں پیچھے ندی بہتی ہے تم بھی وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ۔ میری جیبوں میں ابھی بھنے ہوئے دانے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی کا ناشتہ کریں گے۔"

لڑکی ندی کی طرف چلی گئی۔ میں نے جیب سے ساری بھنی ہوئی جوار نکال کر رومال میں ڈالی اور اسے فرش پر رکھ دیا۔ پھر پستول نکال کر اس کو غور سے دیکھا۔ یہ پولیس والوں کا مخصوص پرانی ٹائپ کا پستول تھا۔ جس کا ٹریگر کھٹکا دبانے سے بند ہو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پستول کا کھٹکا نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ ہندو سی آئی ڈی انسپکٹر واقعی مجھے گولی مار کر ہلاک کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ خدا کا شکر ہے میں جیب میں ہاتھ ڈال کر جب چل رہا تھا کہ میرا ہاتھ یونہی ٹریگر پر نہیں پڑ گیا تھا ورنہ پستول میری جیب کے اندر ہی چل جاتا۔ میں نے فوراً ٹریگر کا کھٹکا لگا دیا۔ اس کے چیمبر میں سات گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے پستول دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ میری نگاہیں مغرب کی جانب نظر آنے والی

پہاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہاڑیاں مجھے یاد تھیں۔ ہندو تخریب کاروں کا لیڈر پاکستان کے بارڈر پر جانے کے لئے ہمیں انہی پہاڑیوں میں سے لے کر گزرا تھا۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے پاکستان کی سرزمین تھی۔ اتنی دیر میں لڑکی منہ ہاتھ دھو کر آ گئی۔ ہم نے چبوترے پر بیٹھ کر بھنی ہوئی جوار کھا کر بھوک مٹائی لڑکی پوچھنے لگی۔

"یہاں سے پاکستان کتنی دور ہے بھائی؟"

میں نے مغرب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یوں سمجھ لو کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے پاکستان ہے"

لڑکی نے پراشتیاق نگاہوں سے دور پہاڑیوں کی طرف دیکھا اور گہرا سانس بھر کر بولی۔

"ویرجی! کیا سچ مچ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ملک پاکستان پہنچ جاؤں گی؟"

میں نے کہا۔

"اللہ کو منظور ہوا تو ضرور پہنچ جاؤں گی"

وہ بولی۔

"آپ بے شک مجھے پاکستان کا بارڈر پار کرا کر واپس آ جانا۔ پاکستان پہنچ کر میں اپنی ماں کے رشتے داروں کے گاؤں میں پہنچ جاؤں گی۔ وہاں کوئی نہ کوئی میرا مسلمان بھائی مجھے وہاں پہنچا دے گا۔"

مگر میں لڑکی کو پاکستان میں داخل ہو کر اس کے رشتے داروں کے پاس خود لے کر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ لڑکی پاکستان میں غلط قسم کے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ لڑکی نے مجھے بھائی کہا تھا کہ اب میری ذمے داری بنتی تھی کہ میں اس کی عزت آبرو کی حفاظت کروں اور اسے خود ان کے عزیزوں کے پاس چھوڑ کر آؤں۔ میں نے سوچا تھا کہ اسی بہانے میں اپنے والد صاحب کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھ لوں گا اور ان کی روح کو مخاطب کر کے کہوں گا کہ میں نے ان کی وصیت پر پورا عمل کیا ہے۔ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ بھارتی فوج اور بھارتی حکومت کشمیریوں پر ظلم کر رہی ہے مگر ہمارا جہاد

بھی جاری ہے اور یہ جنگ یہ مقدس جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب کہ کشمیر کا بچہ بچہ حق خود ارادیت حاصل کر کے بھارتی غلامی کی زنجیروں کو توڑ نہیں دیتا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم پہلی بار پاکستان جا رہی ہو۔ تمہیں وہاں کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ میں خود تمہارے ساتھ بارڈر کراس کر کے پاکستان جاؤں گا اور تمہیں تمہارے رشتے داروں کے حوالے کر کے واپس کشمیر آ جاؤں گا۔"

لڑکی کہنے لگا۔

"بارڈر پر تو فوج ہوگی۔ ہم بارڈر کے پار کیسے جائیں گے۔ میرا چاچا چوہڑ سنگھ بارڈر پر سمگلنگ کا دھندا کرتا تھا۔ وہ میرے باپو کو کہا کرتا تھا کہ انڈیا کا بارڈر تو ہم دے دلا کر پار کر لیتے ہیں مگر پاکستان کا بارڈر پار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہاں کوئی رشوت نہیں چلتی اور ہمیں آدھی آدھی راتوں کو اندھیرے میں دریا پار جانا پڑتا ہے اور بارڈر فورس کی فائرنگ سے ہمارے کئی آدمی مارے بھی جا چکے ہیں۔ پھر ہم کیسے بارڈر پار کریں گے۔"

لڑکی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پاکستان کا بارڈر غیر قانونی طور پر کراس کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر میرے سامنے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مجھے ہر حالت میں غیر قانونی طور پر ہی بارڈر کراس کرنا تھا اور لڑکی کو بھی ساتھ ہی بارڈر کراس کرانا تھا۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں تھی۔ اگرچہ اس میں بھی جان کا خطرہ تھا مگر اور کوئی ترکیب نظر نہیں آ تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بارڈر پر پہنچیں گے تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تمہیں اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں نے گھر میں کسی کو کہتے سنا تھا کہ پاکستان سے کمانڈو بارڈر پار کر کے کشمیر آتے ہیں اور کشمیری مجاہد بھی پاکستان چلے جاتے ہیں۔ کیا ہم کسی ایسی ہی جگہ سے بارڈر کراس نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے بالکل غلط سنا ہے۔ پاکستان سے کبھی کوئی کمانڈو سرحد پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہوا۔ کشمیری مجاہدوں کو بھی پاکستان آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کشمیر کا بچہ بچہ کمانڈو بن کر اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کشمیر کا ہر مسلمان اپنی جگہ پر حریت پسند کمانڈو ہے پاکستان مسلمان ملک ہونے کے ناطے اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کی اخلاقی اور سفارتی سطح پر مدد ضرور کرتا ہے۔ مگر پاکستان سے کوئی کمانڈو کشمیر نہیں جاتا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کشمیری مجاہد بھارتی فوجیوں سے چھینے ہوئے اسلحہ سے لڑتے ہیں۔ وہ دشمن کے کانوائوں پر حملہ کر کے اسلحہ حاصل کرتے ہیں اور دشمن کا اسلحہ دشمن کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔"

لڑکی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ پھر کہنے لگی۔

"دونوں طرف سمگلر بھی تو بارڈر کراس کرتے ہیں۔ ہم کسی سمگلر کی مدد سے بارڈر کراس نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا۔

"پاکستان کی بارڈر فورس نے سیکورٹی کے بے حد سخت انتظامات کر رکھے ہیں اب کوئی سمگلر بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

وہ مایوس سی ہو کر کہنے لگی۔

"تو کیا میں پاکستان نہیں پہنچ سکوں گی؟"

میں نے کہا۔

"جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ تم فکر نہ کرو"

میرے دل میں یہ تجویز بھی آئی تھی کہ انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو لڑکی سمیت پاکستانی بارڈر فورس یعنی پاکستانی رینجرز کے حوالے کر دوں گا اور ان سے کہوں گا کہ میں ویزا لے کر انڈیا گیا تھا۔ وہاں ایک دو دن زیادہ ٹھہر گیا۔ پولیس نے مجھے جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا۔ میرا پاسپورٹ بھی چھین کر غائب کر دیا۔ مجھ پر بے پناہ تشدد کیا

اور جیل میں ڈال دیا۔ میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور پنجاب کی طرف انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے لئے آگیا۔ وہاں یہ لڑکی مل گئی جس کی ماں کو قیام پاکستان کے وقت سکھوں نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ لڑکی اس بدنصیب مسلمان مغویہ خاتون کی بیٹی ہے جو اب پاکستان میں جینا مرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی جو لازمی بھی تھی۔ یعنی ہمیں غیر قانونی طور پر پاکستان کا بارڈر کراس کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال د[یا] جاتا۔ ہم پر مقدمہ چلتا ضابطے کی ساری کارروائی پوری کی جاتی اور ہم دونوں کو قید ہو جاتی۔ اس کی وجہ سے میں کشمیر کی جنگ سے دور ہو جاتا تھا اور خدا جانے ہمیں کتنی قید سنائی جاتی۔ چنانچہ میں نے اس منصوبے کو ذہن سے نکال دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ دریا پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ قسمت اچھی ہوئی تو لڑکی کو لے کر پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ اگر رینجرز کی گولیوں سے ہلاک ہو گیا تو پھر مر جاؤں گا۔ اور کیا کر سکتا تھا۔

میں نے لڑکی کو اس منصوبے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور اس سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستان پہنچنے کے لئے جان کی بازی لگا سکو گی؟"

وہ بولی۔

"میں ایک بار نہیں سو بار پاکستان پر جان قربان کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"یہ پاکستان پر جان قربان کرنے والی بات نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی طور پر پاکستان پہنچنے کی خاطر جان قربان کرنے کا معاملہ ہے۔ اگر تم اس کے لئے تیار ہو تو میں تمہیں لے کر آگے چلتا ہوں۔ اگر نہیں تو یہیں سے واپس ہو جاتے ہیں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں تو آنسو آگئے کہنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے واپس نہ لے جانا۔ میں کنوئیں میں کود کر مر جاؤں گی۔ مجھے اگر مرنا ہی ہے تو پاکستان کے ملک میں داخل ہونے کی کوشش میں مروں گی پھر میری روح کو مرنے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔"

میں آپ کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اپنی کہانی بیان کرنے سے پہلے آپ سے عہد کیا تھا کہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا اور اپنے دل کا حال بھی پوری سچائی کے ساتھ آپ کو بتادوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں غیر قانونی طور پر پاکستان کا بارڈر کراس نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ بات بھی تھی کہ پاکستان کا بارڈر کراس کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ سن 65ء کی جنگ کے بعد پاکستانی سرحد پر سیکورٹی انتہائی سخت ہو گئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں طرف بارڈر فورس کی بجائے فوجوں نے مورچے سنبھال رکھے ہوں۔ لیکن اس بدنصیب لڑکی کو جو مسلمان ماں اور سکھ باپ کی بیٹی تھی میں ہندوستان میں ایسی حالت میں اکیلی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ اس پر اپنے منگیتر اور چچا دونوں کو قتل کرنے اور سکھ باپ کو قتل کرنے کی کوشش کرنے کا الزام عائد ہو۔ اب وہ اپنے سکھوں کے گھر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر میں اسے ہندوستان میں اکیلی چھوڑتا ہوں وہ یا تو خودکشی کرتی یا پھر اس کی باقی زندگی بھارت کے شہروں کے قحبہ خانوں میں بدترین حالات میں بسر ہوتی۔

یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں نے یہی طے کیا کہ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یا تو دونوں پاکستان پہنچ جائیں گے یا پکڑے جائیں گے اور یا دونوں کی لاشیں سرحد پر پڑی ہوں گی۔ میں اس لڑکی کو کافر دشمنوں کے درمیان اکیلی نہیں چھوڑ سکتا تھا جس کے سینے میں اسلام کی شمع روشن ہو کر اس کی روح کو منور کر رہی تھی۔ میں ایک نئے جذبے کے ساتھ وہاں سے اٹھا اور لڑکی کو ساتھ لے کر آگے چل پڑا۔ راستے میں ایک گاؤں آیا۔ میں نے لڑکی کو درختوں کی اوٹ میں ایک جگہ بٹھا دیا اور خود گاؤں میں آگیا۔ گاؤں کے مکانوں میں ایک مندر کا زرد جھنڈا لہراتا نظر آرہا تھا۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی تھی۔ مسجد محض ایک چبوترہ تھی۔ قبلہ رخ اینٹوں کی محراب تھی اور دو چار صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھا دیہاتی صفیں صاف کر رہا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"جناب میں مسلمان ہوں۔ بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

وہ بولا۔

"گاؤں کے پیچھے جاؤ۔ وہاں مسلمان کا تنور ہے۔ وہاں دال روٹی مل جائے گی"۔

میں پیچھے چلا آیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کے باہر تنور لگا تھا۔ ایک بوڑھی عورت روٹیاں لگا رہی تھی۔ دو مزدور قسم کے آدمی ایک طرف بیٹھے دال روٹی کھا رہے تھے۔ میں نے عورت سے چھ روٹیاں لیں۔ دال ماش کی تھی جو سخت تھی۔ میں نے ہر روٹی پر تھوڑی تھوڑی دال ڈلوائی۔ اسے پیسے دیئے اور روٹیاں لے کر لڑکی کے پاس آگیا۔

میں نے کہا۔

"دال روٹی مل گئی ہے۔ کچھ کھا لیتے ہیں۔ کچھ ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ آگے کام آئے گی۔"

تنور کی روٹی اور دال بڑے مزے سے ہم دونوں نے کھائی۔ اور وہاں سے چل پڑے۔ آگے ایک پہاڑی نالہ مل گیا۔ وہاں سے پانی پیا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ہم اب تھوڑا تھوڑا چلتے تھے۔ اور آرام بھی کر لیتے تھے۔ رات ہو گئی۔ یہ رات ہم نے ایک پہاڑی کے نیچے بنے ہوئے چھوٹے سے غار میں گزار دی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد پہاڑی علاقہ تقریباً ختم ہو گیا اور میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ انڈیا پاکستان کی سرحد قریب آرہی ہے۔ مجھے یاد تھا کہ اس میدانی علاقے کے بعد دوبارہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آجاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان دریائے راوی بہتا تھا جو آگے جا کر پاکستان میں داخل ہو جاتا تھا۔ مجھے لڑکی کو ساتھ لے کر اسی دریا کے ذریعے بارڈر کراس کرنا تھا جو انتہائی خطرناک ایکشن تھا۔ دریا کی دونوں جانب پاکستان سرحد پر رینجرز کے جوانوں کے مورچے تھے اور رینجرز کی جیپیں بھی گشت کرتی رہتی تھیں اور دریا میں بھی اپنے علاقے میں رینجرز کی کشتیاں دیکھ بھال کے لئے چکر لگاتی رہتی تھیں۔ سمگلر کو دیکھتے ہی گولی مار دی جاتی تھی۔ اس قسم کی سیکورٹی کے انتظامات سے بچ نکلنا بڑا مشکل کام تھا۔ خاص طور پر جب کہ ایک عورت بھی ساتھ ہو جو نہ تیر سکتی تھی اور نہ میری طرح اپنا بچاؤ کر سکتی تھی۔

میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم پاکستان کیسے پہنچے۔ بس اتنا ہی بتانا کافی ہے کہ میں لڑکی کو لے کر پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے لڑکی کو بتایا کہ ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو وہ فوراً رک گئی مجھ سے پوچھا۔

"کعبہ کس طرف ہے؟"

میں نے اسے کعبے کی سمت بتائی تو وہ وہیں سجدے میں گر پڑی اور سجدے میں گری ہوئی رونے لگی۔ میں نے اسے بالکل نہ اٹھایا۔ وہ رو رو کر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اپنی ماں کو یاد کر کے کہہ رہی تھی۔ ماں! میں اسلام کے ملک پاکستان میں آگئی ہوں۔ ماں! میں پاکستان پہنچ گئی ہوں۔ رونے سے جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کبھی آسمان کو اور کبھی اردگرد پھیلے ہوئے اور نومبر کے دن کی دھوپ میں چمکتے ہوئے کھیتوں اور درختوں کو دیکھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ آنکھوں سے لگایا اور بولی۔

"میرے پیارے بھائی! تم نے میرے لئے وہ کام کیا ہے جو شاید میرا سگا بھائی ہوتا تو وہ بھی نہ کر سکتا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میری بہن! میں نے جو کچھ کیا ہے ایک مسلمان بھائی کا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ چلو اب میں تمہیں تمہارے عزیزوں کے گھر لے چلوں۔"

وہ آنسو پونچھتی خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑی۔ میرے دل کو ایک ہی دھڑکا لگا تھا کہ اگر اس لڑکی کے رشتے داروں نے جو اصل میں اس کی بدنصیب ماں کے رشتے دار تھے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ اس لڑکی کا تو پھر کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ اسے واپس انڈیا لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان میں خود میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا کہ جن کے پاس میں اسے چھوڑ کر کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے کے

لئے واپس چلا جاتا۔ ایک ہی چھوٹی بہن تھی جو مشرقی پنجاب میں فسادات کے وقت شہید
کر دی گئی تھی۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ باپ مجھے آخری وصیت کر کے اس دنیا سے
رخصت ہو چکا تھا۔ پاکستان میں کوئی دوست یار بھی نہیں تھا ایسی صورت میں میں اسے
پاکستان کے کسی یتیم خانے یا کسی زنانہ ویلفیئر ادارے کے حوالے بھی نہیں کر سکتا تھا۔
مجھے معلوم تھا کہ وہاں بھی یہ زندہ نہیں رہے گی۔ یہ لڑکی اپنے ساتھ اتنا بڑا المیہ لے کر
پاکستان میں داخل ہوئی تھی کہ اگر اسے اس کے رشتے داروں نے قبول نہ کیا تو یہ خودکشی
کر لے گی۔

خیالات میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے اور ہم کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے
ایک پکی سڑک پر آ گئے جو ایک قریبی شہر کو جاتی تھی۔ میں اس شہر کا نام بھی نہیں لکھوں
گا۔ ہم نے اس شہر سے گجرات جانے والی ٹرین پکڑی اور گجرات پہنچ گئے۔ یہاں سے لڑکی کا
گاؤں جہاں اس کی والدہ کے رشتے دار رہتے تھے کوئی پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر واقع
تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم نے گجرات کے ریلوے سٹیشن کے باہر ایک ہوٹل میں کھانا
کھایا اور لاری میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لڑکی پاکستان کی فضاؤں میں
آ کر بے حد خوش نظر آنے لگی تھی۔ رستے میں اس نے جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی
تھیں ان کا ذرا بھر بھی اس کے چہرے پر اثر باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے یاد ہے پاکستان میں
داخل ہونے کے بعد اس نے ایک گاؤں کی سفید میناروں والی مسجد دیکھی تو سکھوں کی
طرح اس کی طرف ہاتھ جوڑ کر سلام کیا تھا۔ میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا اور
کہا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان مسجد کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر سلام نہیں کرتے۔ اس
کے بعد اس نے ایسا تو نہیں کیا تھا مگر جب کسی مسجد کو دیکھتی تو اس کے منہ سے بے اختیار
نکل جاتا۔

"اللہ میاں' اللہ میاں!"

گجرات سے لاری چھوٹی سڑک پر پڑ گئی تھی۔ دونوں جانب ہرے بھرے کھیت لہلہا

رہے تھے۔ فصلوں کو دیکھ کر لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کہنے لگی۔

"پاکستان کتنا سوہنا وطن ہے۔ یہ اب میرا وطن ہے۔ یا اللہ! اللہ میاں! میں تیرا کس
زبان سے شکریہ ادا کروں"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ویرجی! اس وقت میری ماں کی روح جنت میں بڑی خوش ہو رہی ہو گی۔"

ڈیڑھ گھنٹے میں ہم لڑکی کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا سا بڑا خوش حال گاؤں تھا۔
اس کا نام لڑکی نے مجھے بتا دیا ہوا تھا جو میں یہاں ظاہر نہیں کروں گا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا ہم
نے کھیتوں کے باہر ایک آدمی سے لڑکی کی والدہ کے رشتے داروں کا نام لے کر ان کے
مکان کا پتہ پوچھا اور کچھ دیر کے بعد ہم ایک صاف ستھرے صحن والے کچے مکان کے باہر
کھڑے تھے۔ صحن میں ایک عورت زمین پر دری بچھا کر بیٹھی لحاف کو نگندے لگا رہی
تھی۔ ایک جوان آدمی کونے میں بھینس کے لئے گتاوا بنا رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی مکان
کے برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں لحاف کے نگندے لگانے والی عورت نے سب
سے پہلے دیکھا اور ہماری طرف دیکھ کر ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

"پترا! کس کو ملنا ہے تم نے؟"

میں نے لڑکی کی والدہ کے مرد رشتے دار کا نام لے کر پوچھا۔

"بہن جی! ان کا گھر یہی ہے"

وہ بولی۔

"گھر تو یہی ہے۔ اندر آ جاؤ پترا!"

جوان آدمی جو بھینس کے لئے گتاوا بنا رہا تھا وہ دھوتی سے ہاتھ صاف کرتا ہوا ہماری
طرف بڑھا۔ برآمدے میں جو بوڑھا حقہ پی رہا تھا وہ بھی ہمیں دیکھنے لگا۔ عورت نے جوان
مرد سے کہا۔

"سراج پتر ان کے لئے چارپائی ڈال تمہارے تایا جی کے ملنے والے ہیں۔"

ہمارے لئے چارپائی ڈال دی گئی۔ ہم اس پر بیٹھ گئے۔ مکان کی کوٹھڑی سے بھی ایک

جوان لڑکا نکل کر آگیا۔ بوڑھا بھی حقہ وہیں چھوڑ کر ہمارے قریب آکر دری پر بیٹھ گیا۔

"تم کون ہو پتر؟"

بوڑھے نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"ذرا سانس لے لوں چاچا جی! ابھی بتاتا ہوں۔"

انہوں نے ہمیں دودھ پلایا۔ لڑکی میرے پاس بیٹھی اس گھر کی درودیوار کو اور ان لوگوں کو اسی طرح خوش ہو کر دیکھ رہی تھی جیسے جیل سے چھوٹ کر قیدی اپنے گھر میں آجاتا ہے۔ دونوں جوان لڑکے بھی اپنی ماں کے پاس جو لحاف نگند رہی تھی دری پر بیٹھ گئے تھے۔ عورت نے پوچھا۔

"بیٹا! تم کہاں سے آئے ہو اور مہردین تمہارا کیا لگتا تھا؟"

مہردین میں نے فرضی نام لکھ دیا ہے۔ جس آدمی کے گھر میں ہم آئے تھے اس کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں نے ان لوگوں کی طرف ایک نگاہ ڈال کر آہستہ سے لڑکی کی ماں کا نام لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ زینا بی بی کو جانتے ہیں؟"

اس کا نام سن کر سب کے چہرے ایک دم خاموش ہو گئے۔ لڑکی ان لوگوں کو بڑی اشتیاق کی نظروں سے تک رہی تھی جیسے وہ ابھی یہ کہہ کر لڑکی کو گلے لگالیں گے کہ یہ ہماری بہن زینا کی بیٹی ہے۔ عورت نے اپنے بوڑھے خاوند کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے بھائی کی بیٹی کا پوچھ رہے ہیں۔"

پھر اسی عورت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹا! میرے خاوند کے بھائی کی ایک بیٹی زینا ضرور تھی مگر وہ تو اپنے سارے کنبے کے ساتھ فسادات میں سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی۔ اس بات کو اتنے برس گزر گئے ہیں۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ہم نے مہاجروں کے سارے کیمپوں میں انہیں تلاش کیا تھا مگر کہیں نہیں ملے تھے۔ پھر ان کے گاؤں کے ایک آدمی نے ہمیں بتایا تھا کہ زینا بی بی اپنے گھر والوں کے ساتھ جس قافلے میں پاکستان آرہی تھی اس پر ہندو سکھوں کے جتھے نے حملہ کر کے ان سب کو شہید کر دیا تھا۔"

میں نے کہا

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ سکھوں نے قافلے پر حملہ بھی کیا تھا اور زینا بی بی کے گھر کے سارے لوگ مارے گئے تھے مگر زینا بی بی بچ گئی تھی۔"

"بچ گئی تھی؟"

جوان آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں"

میں نے کہا۔

"اس کو ایک سکھ اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس سکھ نے زینا سے شادی کر لی تھی اور یہ لڑکی زینا کی اولاد ہے۔ اس لڑکی کی والدہ زینا بی بی نے اسے تم لوگوں کا پتہ بتایا تھا اور میں اسے لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور شدت جذبات سے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ پھر وہ بولنے لگی۔ اس نے اپنی والدہ کا سارا حلیہ اس کی عادتیں اور اس کا رنگ روپ بیان کیا اور کہا کہ میری ماں نے کہا تھا کہ جب بڑی ہو جاؤ تو سکھوں میں نہ رہنا۔ یہاں سے بھاگ کر پاکستان مہردین اپنے تایا کے گھر چلی جانا۔

اس گھر کے سارے فرد حیرت سے منہ کھولے لڑکی کی کہانی سن رہے تھے۔ جب لڑکی نے اپنی المناک کہانی ختم کی اور کہا۔

"یہ میرا بھائی مسلمان ہے۔ جب میں سکھوں کے گھر سے پاکستان جانے کے لئے بھاگی تو یہ مجھے مل گیا۔ اس نے میری بپتا سن کر کہا کہ تم میری بہن۔ میں بھی پاکستان جا رہا

ہوں۔ تمہیں بھی پاکستان لے چلوں گا۔ اور اب میں آپ کے پاس آگئی ہوں۔ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے دیجئے تاکہ میں ساری زندگی آپ کی سیوا کرتی رہوں۔"

لڑکی کے منہ سے چرنوں اور سیوا کے الفاظ بے اختیار نکل گئے تھے۔ آخر وہ سکھوں کے ماحول میں جمی پلی تھی۔ سب گھر والے لڑکی کو ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی اجنبی لڑکی ہو۔ صرف بوڑھے آدمی نے اٹھ کر لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا تو جوان لڑکے نے اسے جھڑک کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"ابا تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ہمیں کیا پتہ یہ لڑکی کون ہے"

پھر اس لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بھائی صاحب آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ لڑکی ہمارے تایا کی بیٹی ہے" میں نے کہا۔

"میرے پاس کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ہے اور میں اس کی شہید ماں کی روح کو بھی گواہی دینے کے لئے یہاں نہیں بلا سکتا یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس لڑکی کو اپنا خون سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے"

دوسرے جوان آدمی نے بھڑک کر کہا۔

"یہ ہمارا خون نہیں ہے۔ پتہ نہیں کس سکھڑے کی اولاد ہے۔ تم بھی مجھے کوئی فراڈیئے لگتے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں پولیس والوں کو بلاؤں بہتر ہے کہ تم اس لڑکی کو لے کر ہمارے گھر سے نکل جاؤ۔"

یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ ایک بار تو میرا بھی خون کھول گیا۔ لڑکی کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اسے اپنی والدہ کے سگے رشتے داروں سے اس غیروں سے بھی بد تر سلوک کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اس جوان آدمی کو بڑے تحمل کے ساتھ کہا۔

"بھائی صاحب! آپ لوگ اتنی جلدی یہ فیصلہ نہ کریں۔ اگر آپ نے اس لڑکی کو قبول نہ کیا تو پھر اس کے لئے کوئی ٹھکانہ ---"

دوسرا جوان آدمی پھٹ پڑا۔

"ہم اندھے کانے بہرے نہیں ہیں کہ یونہی کسی ایری غیری لڑکی کو اپنی تایا زاد بہن کی بیٹی سمجھ کر گھر میں بٹھالیں۔ تم ابھی اسی وقت اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ہماری گاؤں میں عزت آبرو ہے۔ ہم کسی سکھ کی اولاد کو نہیں پال سکتے۔ جاؤ۔ لے جاؤ اسے۔"

لڑکی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر اس گھر پر جوان لڑکوں کی حکومت تھی۔ بوڑھا مجبور تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! میرے ساتھ واپس چلو۔ تمہارے رشتے داروں نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔"

"ہم اس کے رشتے دار نہیں ہیں۔"

پہلے جوان لڑکے نے اونچی آواز میں کہا۔ میں اسے سبق سکھانے کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنا منہ بند رکھا۔ وہ میرے بولنے کا مقام نہیں تھا۔ لڑکی زار وقطار روئے جا رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اٹھو میری بہن! اللہ مالک ہے۔"

اس نے اٹھنے کے بعد اپنا سر میرے بازو کے ساتھ لگا دیا اور زار وقطار روتی ہوئی مکان سے باہر نکل آئی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! تمہارا رونا اب یہاں کون دیکھے گا۔ کسی پر اثر نہیں ہو گا۔ یہ لوگ تمہاری والدہ کے رشتے دار بڑے سنگدل لوگ ہیں۔"

لڑکی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"میرے ویر جی! اب تو میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔"

اور ایک بار پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"بہن! یہ مت کہو کہ تمہارا کوئی نہیں رہا میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

لیکن لڑکیوں نے ساری عمر بھائیوں کے پاس نہیں رہنا ہوتا۔ انہیں اپنا ایک الگ گھر

بسانا ہوتا ہے۔ ایک نئی انسانی نسل چلانی ہوتی ہے۔ ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنی ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں ہرلڑکی کے تحت الشعور میں ہوتی ہیں اور وہ غیرشعوری طور پر اسی اپنی منزل کوحاصل کرنے کے لئے ساری زندگی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔

لڑکی بے چاری پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا وہ اپنی جگہ پر تھا مگر میں بھی سخت الجھن میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں اس لڑکی کو کہاں لے جاؤں؟ اس کا حال کس طرح باعزت طریقے سے گزر سکے گا۔ اس کا مستقبل کیسے محفوظ ہو گا۔ آخر ایک ہی طریق کار میری سمجھ میں آیا۔ اس زمانے میں لاہور میں بے آسرا خواتین کا ادار اپوا قائم ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں یہ لڑکی عافیت اور عزت آبرو کے ساتھ ر سکتی تھی۔ یہ ادارہ ایسی بچیوں کی شادیاں بھی کرا دیتا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس وقت اس بارے میں کوئی ذکر نہ کیا۔ گاؤں سے نکل کر ہم کھیتوں میں چلے جا رہے تھے۔ میں نے لڑکی کو حوصلہ دینے کی کوشش کی اور کہا۔

"سب رشتے دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے سلوک پر تم دل چھوٹا نہ کرنا۔"

پھر میں نے اسے اپوا کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور کہا کہ وہاں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں اور سلائی کڑھائی کا کام بھی سیکھ لیتی ہیں۔ پھر کہیں نہ کہیں ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ لڑکی خاموش تھی۔ رشتے داروں کے گھر سے مایوس ہو کر نکلنے کے بعد اس کے ہونٹوں کو خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرد آہ بھرتی اور آسمان کی طرف دیکھ کر سر جھکا کر خاموشی سے چلتی رہتی۔ میں نے سوچا کہ ساری کی ساری امیدیں چکنا چور ہو گئی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ چپ تھی۔ لاہور چل کر جب میں اسے اپوا کے ادارے میں لے جاؤں گا تو وہاں کا ماحول اور دوسری خواتین کو کام کرتے دیکھ کر اس کا مایوسی کا موڈ تبدیل ہو جائے گا۔ ہم سڑک پر اس جگہ آ گئے جہاں ہم لاری میں سے اترے تھے۔ میں اس کے دل سے مایوسیوں کے اندھیرے دور کرنے کے لئے اپوا کے خوشگوار ماحول کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لڑکی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ سوائے ہوں ہاں کے زبان سے کچھ نہیں

بولتی تھی۔

ہمیں سڑک کے کنارے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ کوئی لاری نہ آئی۔ ایک کسان ادھر سے گزرا تو میں نے اس سے پوچھا کہ گجرات جانے والی لاری کب آتی ہے۔ اس نے کہا۔

"لاری کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ آپ لوگ سٹیشن پر جا کر گاڑی کیوں نہیں پکڑ لیتے وہ سامنے ہی سٹیشن ہے۔"

میں نے سوچا کہ یہ ٹھیک ہے۔ یہاں فضول انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"چلو ٹرین پکڑ لیتے ہیں۔ شاید گاڑی گجرات سے ہو کر سیدھی لاہور جا رہی ہو۔"

ہم اس طرف چلے جس طرف کسان نے اشارہ کیا تھا۔ ادھر درختوں کے پیچھے ریلوے لائن تھی۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ فاصلے پر کوئی چھوٹا سٹیشن تھا جس کا سگنل کا کھمبا دور سے نظر آ رہا تھا۔ ایک ٹرین بھی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ہم لائن کے ساتھ جو پٹڑی تھی اس پر چلے جا رہے تھے۔ ٹرین کے انجن نے دو تین بار سیٹی دی اور ٹرین سٹیشن سے چل پڑی۔ ٹرین ہماری طرف آ رہی تھی۔ شاید یہ راولپنڈی جا رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"پٹڑی سے نیچے آ جاؤ۔ ٹرین آ رہی ہے۔"

اس نے چہرہ اٹھا کر دور سے آہستہ آہستہ آتی ٹرین کو دیکھا اور میرے پیچھے پیچھے پٹڑی سے نیچے آ گئی۔ نیچے جھاڑیوں میں ایک جگہ پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ہم اس پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔ ٹرین قریب آ رہی تھی۔ لڑکی ٹرین کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے بالکل محسوس نہ کیا کہ لڑکی مجھ سے ذرا پرے ہونے لگی ہے۔ یعنی وہ ان جھاڑیوں کی طرف ہو کر چل رہی تھی جن کے اوپر ذرا سی چڑھائی پر ریلوے لائن تھی۔ میرا دھیان بھی ٹرین کی طرف تھا۔ یہ ڈیزل انجن والی ٹرین تھی اور اس کی رفتار سٹیشن سے نکلنے کے بعد ابھی ہلکی تھی۔ انجن بہت بڑا تھا۔ جیسے ہی انجن ہم سے تھوڑے فاصلے پر آیا تو قدرتی

طور پر میں پگ ڈنڈی پر ذرا پرے ہٹ گیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

اس طرف آجاؤ"

لیکن لڑکی ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ ایک طرف ہونے کی بجائے تیزی سے ڈھلان چڑھ کر ریلوے لائن کے پاس گئی۔ انجن اب سر پر آگیا تھا۔ لڑکی نے ایک چیخ ماری اور اپنے آپ کو انجن کے آگے گرا دیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوگیا کہ میں لڑکی کو دوڑ کر پکڑ نہ سکا۔

ٹرین کو ایک دم بریکیں لگیں اور ٹرین رکنے لگی۔ میں دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ انجن نے لڑکی کے جسم کے کتنے ٹکڑے کئے تھے۔ وہاں شور مچ گیا۔

"عورت ٹرین کے نیچے آگئی ہے۔"

ایک دم جیسے میں ہوش میں آگیا۔ میں دوڑ کر انجن کے پاس گیا۔ انجن لڑکی کے جسم کے ٹکڑے اڑاتا ہوا کچھ دور آگے جا کر رک گیا۔ میں نے ٹرین کے ایک ڈبے کے نیچے ریلوے لائن پر خون اور انسانی جسم کے اعضاء بکھرے ہوئے دیکھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ میں اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ انجن میں سے ڈرائیور اور اسسٹنٹ ڈرائیو نکل کر میری طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ انہوں نے لڑکی کو میرے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری کون تھی؟"

"اس نے خودکشی کیوں کی؟"

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ پیچھے جاؤ۔"

ڈبوں میں سے اتر اتر کر مسافر وہاں جمع ہو رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت زمیں سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ ٹرین میں پولیس کے چار پانچ سپاہی بھی سفر کر رہے تھے۔ انجن ڈرائیور نے پولیس کانسٹیبل کو بتایا کہ عورت نے خودکشی کی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو انجن کے آگے گرا دیا تھا۔ یہ عورت اس آدمی کے ساتھ آرہی تھی۔ پولیس کے حوالدار نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پوچھا۔

"یہ عورت تمہاری کون تھی؟"

میں نے کہا۔

"میری بہن تھی"

"کیا تم نے اسے دھکا دیا تھا؟"

حوالدار کے اس سوال پر میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"نہیں۔ وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف ہٹنے کے لئے کہا مگر اس نے انجن کے آگے چھلانگ لگا دی"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں تھانے چل کر بیان قلمبند کرانا ہوگا۔"

پولیس مجھے دوسری گاڑی میں بٹھا کر گجرات لے آئی۔ یہاں تھانے میں مجھے ایک ے میں بٹھا دیا گیا۔ تھانیدار نے مجھے پانی پینے کو دیا اور سوالات پوچھنے لگا کہ میں کون ں؟ اپنی بہن کو لے کر کہاں سے آرہا تھا۔ کہاں جا رہا تھا۔ کیا میں نے اسے دھکا دیا تھا؟ نے انہیں اپنا اصلی نام بتا دیا۔ مگر اس کے آگے بالکل نہ بتایا کہ میں انڈیا سے لڑکی کو کر آرہا تھا۔ میں تھانیدار کو یہ بھی نہ بتا سکا میں کس گاؤں کا رہنے والا ہوں لڑکی کو لے کر میں کہاں سے آرہا تھا۔ اگر پولیس کو سچ بتاتا تو معاملہ بڑی نازک شکل اختیار جاتا۔ میں ان پر کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ میں کشمیر کے محاذ سے آرہا ا اور لڑکی کی اصل کہانی کیا تھی اور یہ کہ میں کمانڈو ہوں اور ہم غیر قانونی طور پر انڈیا پاکستان کا بارڈر کراس کر کے آئے تھے۔ یہ معاملہ الجھ سکتا تھا۔ مگر میں دوسری طرح بھی جب پولیس کو مطمئن نہ کر سکا کہ میں لاہور میں کہاں رہتا ہوں اور لڑکی کو لے کر ں سے آرہا تھا تو تھانیدار کو مجھ پر شک پڑ گیا کہ میں کوئی پراسرار اور مشتبہ آدمی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ سنگین شکل اختیار کرتا جا رہا ہے تو میں نے تھانیدار کو ی کہانی تو نہ بتائی صرف اتنا بتا دیا کہ میں کشمیر کے محاذ پر اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں ساتھ مل کر بھارتی ظلم واستبداد کے خلاف جہاد میں مصروف تھا کہ یہ لڑکی مجھے مل کہنے لگی کہ میں سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں لیکن میں نے اسلام قبول کر لیا

ہے۔ میری ایک مسلمان سہیلی پاکستان میں گجرات کے پاس ایک گاؤں میں رہتی ہے۔
کے لئے مجھے میری مسلمان سہیلی کے پاس پہنچا دو۔ نہیں تو میرا سکھ باپ مجھے قتل کر
گا۔ پس میں اسے ساتھ لے کر پاکستان آ گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس کی مسلمان سہیلی گا
سے چلی گئی ہے۔

"اب میں اسے اپوا کے ادارے میں لے جا رہا تھا کہ لڑکی نے ٹرین آتے دیکھ
مایوسی کے عالم میں ٹرین کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

تھانیدار کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے میرا بیان جھوٹا لگا ہے اور وہ مجھے شاید انڈیا کا جاس
سمجھنے لگا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے تھوڑی دیر بعد ہی مل گیا جب تھانیدار کے اشارے
مجھے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میری پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔
معلوم تھا کہ آگے ان پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہی چلا جائے گا۔ میں یہ بیان دے چکا تھا
میں غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوا ہوں اور میرے ساتھ ا
سکھ لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔ کیس مزید سنگین ہو گیا تھا۔ میں
بھی طرح یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ ایک تو میری زبان
تھی۔ پولیس کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن بھارت سے ایک مسلمان
جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے پاکستان آ سکتا تھا۔

دوسرے دن مجھے پولیس کی حفاظت میں لاہور کے بڑے پولیس سٹیشن منتقل کر
گیا۔ میں اس پولیس سٹیشن کا یہاں نام نہیں لوں گا۔ پولیس نے مجھ سے پوچھ گچھ شر
کر دی۔ مجھ پر تشدد بھی کیا گیا۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں بھارت
جاسوس یا تخریب کار نہیں ہوں۔ میں نے پولیس کو لڑکی کے بارے میں اصل حقیقت
بیان کر دی، لیکن پولیس کو مجھ پر بھارت کے جاسوس ہونے کا جو شک تھا۔ وہ پختہ ہو
گیا۔

میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

مجھ سے بار بار پوچھا جاتا کہ میرے ساتھ اور کون کون بھارتی جاسوس اور تخریب

آیا تھا اور وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں کیا بتاتا۔ میرے خلاف دو مقدمے درج کر لئے گئے۔
آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ باقی باتیں سب جھوٹ ہیں اور کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے پولیس
کے قبضے سے فرار ہو جانا چاہئے۔ جب میں نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کیا
مجھے بڑی جلدی احساس ہو گیا کہ پاکستانی پولیس کی حراست سے فرار ہونا اتنا آسان کام
نہیں ہے۔ لیکن میں بھی ایک تجربہ کار کمانڈو تھا۔ ایک سکیم میں نے بھی ذہن میں تیار کر
اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ایک روز پولیس مجھے عدالت میں پیشی کے لئے ضلع کچہری
لے گئی۔ میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا مجھے ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ مگر پولیس اس
حقیقت سے بے خبر تھی کہ میں نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں کی ہڈیوں کو مشق کر کے اتنا
یلا بنا لیا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ ہتھکڑی سے آزاد ہو سکتے تھے۔ مجھے قیدیوں کی گاڑی میں
لا کر کچہری لایا گیا تھا۔ دو کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ میری ہتھکڑی کی زنجیر کا ایک سرا
نسٹیبل کی پیٹی سے بندھا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی سے اتار کر جج صاحب کی عدالت کے باہر
لے برآمدے میں بٹھا دیا گیا۔ جس کانسٹیبل کی پیٹی سے میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی ہوئی
اس نے یہ غلطی کی کہ زنجیر پیٹی میں سے کھول کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ شاید عدالت میں
کو اسی طرح پیش کیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے لئے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔
ت میں کسی کیس کی سماعت ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دوسرے لوگ اور دو تین
س والے بھی موجود تھے۔ جو حوالدار مجھے ساتھ لے کر آیا تھا وہ عدالت کے کمرے
چلا گیا تھا۔ اس وقت میرے پاس صرف وہی ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں
ہتھکڑی والی زنجیر تھی۔
یہی میرے فرار کا لمحہ تھا۔

میں نے عدالتوں کے برآمدے کا جائزہ لیا۔ برآمدے کے آگے سامنے درختوں کے
وٹر سائیکل سٹینڈ تھا۔ میرے کانسٹیبل کے پاس رائفل ضرور تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ
یہ فرار ہونے کے بعد گولی نہیں چلائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہوائی فائر کر دے اور مجھے
نے کے لئے میرے پیچھے دوڑ پڑے۔ ایک سپاہی حوالدار کے ساتھ ہی میری فائیل

لے کر جج صاحب کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ اگر وہ دونوں باہر آجاتے ہیں تو میرا فرار مشکل تھا۔

میں نے اس دوران ہاتھوں کو چھپا کر انگوٹھوں کی ہڈیوں کو ملنا شروع کر دیا۔ چند
کے بعد میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے باہر نکل آئے۔ میں نے ہتھکڑی کو اس طرح رکھا کہ معلوم ہو کہ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی ہے۔ برآمدے میں جہاں میں بیٹھا ہوا تھا کچہری کا وہ دروازہ نظر آرہا تھا جہاں سے رکشے وغیرہ اندر آرہے تھے۔ میں نے ایک
کو دیکھا وہ سکوٹر پر سوار تھا۔ اس نے سکوٹر سٹینڈ کے پاس آکر سکوٹر کو کھڑا کیا۔ سکوٹر
انجن کو چلتا چھوڑ کر وہ سٹینڈ کے آدمی کے پاس آکر باتیں کرنے لگا۔ میرے لئے یہ
موقع تھا۔ اپنے ہاتھ میں ہتھکڑی سے باہر نکال چکا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا۔ اور پھر ایک
سے ہتھکڑی پھینک کر سکوٹر کی طرف بھاگا۔ پیچھے شور سا مچا لیکن میں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ میرا ٹارگٹ سکوٹر تھا جس کا انجن چل رہا تھا اور جو اپنے سٹینڈ پر کھڑا تھا۔ چشم زدن میں سکوٹر پر بیٹھا اسے آگے کو دھکا دیا۔ گیئر لگایا اور طوفان کی طرح اسے چلا
ہوئے گیٹ کی طرف رخ کر لیا۔

پیچھے رائفل کے دو فائر ہوئے۔ یہ ہوائی فائر تھے۔ کیونکہ کوئی بھی گولی نہ مجھے
تھی نہ میرے قریب سے ہو کر گزری تھی۔ لوگوں کا شور ضرور مچا ہوا تھا۔ مگر اتنی دیر
میرا سکوٹر کچہری کی حدود سے نکل کر لاہور کی ایک بڑی سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ سڑک
کافی ٹریفک تھی مگر میں سکوٹر کو ادھر ادھر سے گھماتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔ آگے
آگیا۔ یہاں سے میں نے سکوٹر کو بادامی باغ ریلوے سٹیشن جانے والی سڑک پر ڈال
لاہور شہر میرا اپنا شہر تھا۔ اس شہر میں جم پل کر میں جوان ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
کہاں جا رہا ہوں اور یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس زمانے میں ابھی
کے پاس موبائیل ٹیلی فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آگے پولیس میری
بندی اتنی جلدی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پولیس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں
علاقے کی طرف گیا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے حالات کی نزاکت کا احساس تھا اور

معلوم تھا کہ میرے پیچھے انڈیا کی نہیں پاکستان کی پولیس لگی ہے جو اپنی قابلیت اور کارکردگی میں انڈیا کی پولیس سے دس قدم آگے ہے۔ مگر لاہور شہر بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں میرے ایسے تربیت یافتہ کمانڈو کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جس سکوٹر پر میں جا رہا تھا اس کا رجسٹریشن نمبر پولیس نے اس کے مالک سے سکوٹر سٹینڈ پر سے اگر معلوم کر لیا ہو گا تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی بھی جگہ میرا سکوٹر چیک ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے سکوٹر سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اقبال پارک کے قریب ایک جگہ درخت کے نیچے جھاڑیوں میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ دور سے اس پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ جب ہم پاکستان میں داخل ہوئے تھے تو میرے پاس کچھ انڈین کرنسی تھی جو ایک خاص جگہ پر میں نے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروا لی تھی۔ میرے پاس کل ایک سو چالیس پاکستانی روپے تھے جن میں سے اس وقت میری جیب میں صرف چالیس روپے ہی رہ گئے تھے۔ باقی پولیس نے نکال لئے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ روپے بطور امانت پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہوں مگر اب وہ میرے کسی کام کے نہیں تھے۔

میں نے چھوٹی کنگھی سے اپنے گردن تک آئے ہوئے بال درست کئے اور اقبال پارک میں سے ہوتا ہوا بادامی باغ سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس طرف میں اس لئے آیا تھا کہ یہاں ایک قبرستان تھا جہاں میرے والد صاحب آسودہ خاک تھے اور جہاں میں فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا قبرستان ریلوے سٹیشن کے قریب ہی دوسری طرف واقع تھا۔ میں قبرستان میں داخل ہو کر والد صاحب کی قبر پر آگیا۔ میں نے سر پر رومال باندھ لیا اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی اور والد صاحب کی روح کی مغفرت کی دعا کے بعد کہا۔

"میاں جی! میں نے آپ کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا ہے۔ اور جہاد کشمیر میں شامل ہو کر کافروں سے لڑا ہوں اور لڑ رہا ہوں کشمیر جب تک بھارتی قبضے سے آزاد نہیں ہو جاتا میری جنگ جاری رہے گی۔ مجھے عجیب حالات میں پاکستان آنا پڑ گیا ہے۔ کشمیر میں بھارتی فوجیں مسلمان کشمیریوں پر وحشیانہ مظالم کر رہی ہیں لیکن کشمیر کا بچہ بچہ اسلام اور آزادی

کشمیر کے واسطے مرنے مارنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کشمیر میں بہت جلد ظلم کا اندھیرا چھٹ جائے گا اور انشاء اللہ کشمیری غاصب بھارتی حکومت سے اپنا حق خود ارادیت چھین کر رہیں گے۔ میں واپس جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ واپس آگیا تو آپ کی قبر پر ضرور فاتحہ خوانی کے لئے آؤں گا۔ اگر شہید ہو گیا تو آپ سے خدا کے دربار میں ملاقات ہو گی۔"

بادامی باغ کا سٹیشن قبرستان کے قریب ہی تھا۔ یہاں سے سٹیشن پر کھڑی ایک گاڑی نظر آ رہی تھی۔ میں سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے آزاد کشمیر کا بارڈر کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ سٹیشن پر آ کر میں نے پنڈی کا ٹکٹ لیا اور ٹرین کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ یہ خیال بھی تھا کہ لاہور سے جتنی جلدی نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ یہ پسنجر ٹرین تھی۔ جب جہلم پہنچی تو شام ہو رہی تھی۔ راستے میں خیریت ہی رہی۔ پولیس کے سپاہی ایک دو سٹیشنوں پر نظر آئے مگر میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ گوجر خان کا سٹیشن آیا تو میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر دال روٹی کھائی اور دوبارہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ رات کے دو تین بجے کے قریب ریل گاڑی راولپنڈی پہنچی۔ اس وقت پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد میں منتقل ہو چکا تھا۔ مگر ابھی اسلام آباد اتنا گنجان آباد اور خوبصورت نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔ میں پنڈی سے مظفر آباد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس وقت کوئی بس نہیں جا رہی تھی۔ باقی رات پنڈی کے مسافر خانے میں گزاری صبح ہوئی تو سٹیشن کے سامنے ایک گلی کے تنور پر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ چائے پی اور مظفر آباد جانے والی بسوں کے اڈے پر آگیا۔

معلوم ہوا کہ ایک لاری ابھی ابھی گئی ہے۔ اب دس بجے دوسری لاری چلے گی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ تھا۔ سوچا لاری اڈے پر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ کیوں نہ راولپنڈی شہر کی سیر کی جائے۔ مجھے پنڈی دیکھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اسلام آباد کے دارالحکومت بن جانے کی وجہ سے پنڈی کی رونق اور آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نالے کے پل پر آیا تو

یہاں سے اسلام آباد کو ویگنیں جا رہی تھیں۔ آٹھ آنے فی سواری کرایہ تھا۔ میں ایک ویگن میں بیٹھ کر اسلام آباد آگیا۔ کشادہ سڑکیں سرسبز باغ اور عمارتیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ یا اللہ یہ ملک پاکستان تیرے نام پر شہید ہو جانے والوں کی نشانی ہے اس کو تا ابد قائم و دائم رکھنا۔ میں ایک مارکیٹ میں آ کر سجی ہوئی خوبصورت دکانوں کو دیکھتا گھوم پھر رہا تھا کہ میں نے کتابوں کی ایک دکان کے باہر کونے میں ایک تھیلا پڑا ہوا دیکھا۔ مجھے تھیلے پر کچھ شک ہوا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ تھیلا کپڑے کا میلا کچیلا سا تھا جس طرح گھروں کے نلکے وغیرہ مرمت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ تھیلے کو کھولا تو اس کے اندر کوئی چیز سیاہ کپڑے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑا کھول کر دیکھا تو میرا شک درست نکلا۔ یہ دیسی ساخت کا بے حد طاقتور بم تھا جس میں ٹائمر بھی لگا ہوا تھا اور ٹائمر کے ہندسے سیکنڈ کی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس بم کو پانچ منٹ کے بعد دھماکے سے پھٹ جانا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بھارت کی پاکستان دشمن خفیہ ایجنسی را کے تخریب کار پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر رہے تھے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ پھر بڑے آرام سے کپڑے میں لپٹے ہوئے بم کو اٹھایا اور مارکیٹ سے باہر نکل کر ایک سٹور کی دیوار کے پیچھے آ کر بم کو ناکارہ کر دیا۔ میں اس کام میں ماہر تھا۔ مجھے بم کو ناکارہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ ٹائمر کی گھڑی رک گئی۔ میں نے بم کو ایک قریبی نالے میں پھینک دیا اور اوپر سے ہو کر مارکیٹ کے سامنے ایک ہوٹل کے باہر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے کی پیالی کا آرڈر دیا اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد سامنے والی مارکیٹ میں کتابوں کی دکان کی طرف دیکھ لیتا تھا جہاں بم والا تھیلا وہیں پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ را کے ایجنٹوں کی واردات کا طریق کار کیا ہوتا ہے۔ جب بم مقررہ وقت پر نہیں پھٹے گا تو ان کا خاص آدمی یہاں آ کر تھیلے کو اٹھا کر لے جائے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ بم میں جو خرابی واقع ہو گئی تھی۔ وہ خرابی دوبارہ کسی بم میں واقع نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ را کے ایجنٹوں نے جس آدمی کو بم کسی خاص جگہ پر رکھنے کے لئے خریدا ہوتا ہے اس کو رقم صرف اسی صورت میں

ادا کی جاتی ہے کہ جب بم پھٹ کر تباہی مچا دے۔ جب پانچ منٹ گزر گئے اور بم نہ پھ
اور جس نالے میں میں نے بم کو ناکارہ کر کے پھینک دیا تھا اس طرف بھی کوئی دھماکہ
ہوا تو میری آنکھیں عقاب کی طرح جائزہ لینے لگیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد میں نے ایک
آدمی کو دیکھا کہ ایک طرف سے آیا اور برآمدے میں کتابوں کی دکان کے قریب آ کر
ہو گیا۔ اس نے شلوار قمیض کے اوپر پرانا نسواری کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر گلوبند لپی
رکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر ماحول کا جائزہ لیا اور پھر دکان کے شوکی
کے پاس جا کر وہ تھیلا اٹھا لیا جس میں اب بم نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی حیران
کر تھیلے کو کھول کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے تھیلا وہیں پھینکا اور تیز قدموں سے سڑک
کر کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر چلا گیا۔ مجھے اس آدمی کا انتظار تھا۔

میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ چوک میں جا کر ایک اور آدمی اس کے سا
مل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات کی اور پھر ایک تھری سٹار ہوٹل کے عق
میں آ گئے جہاں ایک پرانی ٹیوٹا گاڑی کھڑی تھی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی
سڑک سے ہو کر ہوٹل کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں ان لوگوں کے تعاقب
تھا۔ میں گیٹ کی طرف دوڑا۔ وہاں خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں ایک ٹیکسی میں گھس
اور ڈرائیور سے کہا۔

"میں پولیس انٹیلی جینس کا آدمی ہوں اس ٹیوٹا گاڑی کا پیچھا کرو۔ خیال رکھنا
نظروں سے اوجھل نہ ہو۔"

ٹیکسی ڈرائیور بھی کوئی ایڈونچرس نوجوان تھا۔ کہنے لگا۔

"فکر نہ کریں صاحب۔"

اور اس نے ٹیکسی ٹیوٹا کار کے پیچھے لگا دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی سڑکوں پر اتنا
نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور پر پنڈی اسلام آباد والی کشادہ سڑک تقریباً خالی خالی ہوتی
ڈرائیور نے ٹیوٹا کار اور ٹیکسی کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ ٹیوٹا کار پنڈی
طرف جا رہی تھی۔ کار میں دونوں تخریب کار ہی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کار

تھا۔ مری روڈ پر آ کر ٹیوٹا کار پکی سڑک پر سے اتر کر ایک کچی سڑک پر ہو گئی۔ یہاں آگے
ایک پرانی بستی کے مکانات اور دکانیں تھیں۔ کار ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے ٹیکسی
ڈرائیور سے کہا۔

"گاڑی روک لو"

اس نے ٹیکسی ایک مکان کی اوٹ میں کر کے کھڑی کر دی۔ میں ٹیکسی سے اتر گیا۔
میں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور اسے کہا۔

"یہاں دو منٹ تک میرا انتظار کرنا۔ اگر میں دو منٹ تک نہ آیا تو چلے جانا"

ٹیکسی ڈرائیور فلمی ہیرو کی طرح بولا۔

"او کے صاحب۔ فکر نہیں"

میں نے دیکھا کہ ٹیوٹا گاڑی میں سے دونوں تخریب کار نکل کر بستی کی ایک گلی میں
داخل ہو گئے ہیں۔ تھوڑا فاصلہ رکھ کر میں بھی ان کے پیچھے گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں
دو چار دکانیں اور چائے کا ایک ہوٹل تھا۔ دو تین آدمی آ جا رہے تھے۔ دونوں تخریب کار
گلی میں سے گزرتے ہوئے بائیں طرف گھوم گئے۔ میں گلی کے موڑ پر آیا تو دیکھا کہ جہاں
گلی ختم ہوتی تھی وہاں آگے دو تین کھیت تھے۔ کھیت کے پیچھے مٹی کا اونچا ٹبہ تھا۔ دونوں
آدمی کھیتوں میں جا رہے تھے۔ پھر وہ مٹی کے اونچے ٹبے کے عقب میں میری نظروں سے
اوجھل ہو گئے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ٹبے کی اوٹ میں آ گیا۔ ٹبے کی دوسری
طرف ایک بوسیدہ چار دیواری تھی۔ دونوں اس چار دیواری کے اندر چلے گئے۔

میں ٹبے کی دوسری طرف سے نکل کر چار دیواری کے پیچھے آ گیا۔ چار دیواری کے
اندر جو ایک کوارٹر نما خستہ سا مکان تھا جس کی پچھلی دیوار کی کھڑکی ایک گہری کھائی کی
جانب بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ یہاں کھڑکی کے نیچے مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ
گہری کھائی کا کنارا ایک پتلی سی پگ ڈنڈی کی شکل میں دوسری طرف نکل گیا تھا۔ اسی پگ
ڈنڈی پر مکانوں کا کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ میں پگ ڈنڈی پر چلتا ہوا مکان کی بند کھڑکی کے
نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ میرے نیچے گہری کھائی تھی جس میں جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور

کوڑا کرکٹ ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس مکان کا یہی ایک کمرہ ہے دونوں تخریب کار اسی کمرے میں گئے ہیں۔ میں نے گردن اٹھا کر بند کھڑکی کو غور سے دیکھا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی اب میرے برابر تھی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تھیلے میں سے بم کون نکال کر لے جا سکتا ہے؟ تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

دوسرے آدمی نے تلخ لہجے میں کہا

"میں وہاں زیادہ دیر کیسے رک سکتا تھا؟ کسی کو شک پڑ جاتا تو میں وہیں پکڑ لیا جاتا۔"

پہلے آدمی کی آواز آئی۔

"چیف کو بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ مارکیٹ میں دھماکہ نہیں ہوا۔ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہمیں امرتسر واپس بھیج دیا جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ہمیں ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا بلکہ ہمیں نوکری سے بھی جواب مل جائے گا۔ ساری سکیم کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھیلے میں سے بم کون نکال کر لے گیا۔ آخر تم نے وہاں دور کھڑے ہو کر تھیلے کی نگرانی کیوں نہیں کی۔ یہ تمہاری ڈیوٹی تھی۔"

دوسرے آدمی نے جواب میں کہا۔

"میں سامنے والے سینما گھر کے پاس کھڑا تھا بس دو تین منٹ کے لئے سینما کے بیت الخلا میں چلا گیا تھا۔"

پہلے آدمی نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ اب جو ہو گا اسے ہم دونوں کو بھگتنا پڑے گا۔ چیف سے رات کو ملاقات ہونی ہی ہے۔ بھگوان ہم دونوں کی رکھشا کرے۔ مجھے تو بیڑا غرق ہوتا نظر آ رہا ہے۔"

وہ دونوں جس زبان میں باتیں کر رہے تھے وہ پوٹھوہار کی پنجابی نہیں تھی۔ وہ امرتسر کے ہندوؤں کی پنجابی زبان بول رہے تھے۔ میں اس زبان کے لہجے سے واقف تھا۔

"چیف کتنے بجے ہوٹل میں آئے گا؟"

پہلے آدمی نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"نیکم داس تم آدمی ہو کہ جانور؟ تمہیں کس نے پاس کر کے امرتسر ٹریننگ سنٹر میں بھیجا تھا؟ تمہیں اتنا بھی یاد نہیں کہ چیف ہمیشہ رات کے بارہ بجے کے بعد اپنے ہوٹل میں ملاقات کرتا ہے۔ اب تمہیں ہوٹل کا نام بھی یاد نہیں ہوگا؟"

دوسرے آدمی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"یاد ہے بھایا جی یاد ہے۔ مارگلہ ہوٹل ہے۔ راولپنڈی میں ہے۔ اور کمرہ نمبر سات ہے۔"

"بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ تم یہ سب کچھ نہیں بھولے۔ اب یہاں سے نکلو۔ شہر میں جا کر کچھ ضروری چیزیں بھی خریدنی ہیں۔"

اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ پھر کمرے کا دروازہ بند کرنے اور تالہ لگانے کی آواز سنائی دی۔ میں کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں دیوار ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے سر ذرا سا نکال کر دیکھا۔ دونوں تخریب کار کھیت میں سے گزر کر واپس جا رہے تھے۔ مجھے ان کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مجھے رات کو راولپنڈی کے مارگلہ ہوٹل میں پہنچنا تھا۔ میں پولیس کو اس لئے اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس طرح سے صرف تین تخریب کار ہی پکڑے جاتے۔ میں اپنے طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بھارت کے ان دہشت گردوں کے دوسرے ساتھی پاکستان میں کس کس شہر میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ ان سب کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔ یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ یہ دونوں ہندو ہیں۔ ان کا تعلق بھارت کے ان تخریب کاروں سے ہے جنہیں بھارتی حکومت پاکستان میں دہشت گردی کرنے کے لئے بھیجتی ہے اور ان کا ٹریننگ سنٹر امرتسر میں ہے جہاں ان لوگوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دے کر پاکستان میں بھیجا جاتا ہے۔ میں پاکستان میں بھی ان وطن دشمن تخریب کاروں کے اصل ٹھکانے کا پتہ چلانا چاہتا تھا اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ امرتسر میں کس جگہ ان لوگوں کو پاکستان میں

دھماکے کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ واپس مقبوضہ کشمیر جاتے ہوئے میں اس تخریب کاری کے مرکز کو ہی دھماکے سے اڑادوں۔ اور اس کا پتہ مجھے ان کے چیف باس کی گفتگو سن کر لگ سکتا تھا۔ جب دونوں ہندو تخریب کار بستی میں نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میں بھی وہاں سے واپس چل پڑا۔ دن کا باقی حصہ میں نے پنڈی میں ہی ایک جگہ روپوش ہو کر گزار دیا۔ رات کو پہلا شو دیکھنے ایک سینما ہاؤس میں گھس گیا۔ رات کے سوا نو بجے شو ختم ہوا تو کچھ وقت راجہ بازار کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے اور چائے پیتے ہوئے گزار دیا۔ مارگلہ ہوٹل میں بھارتی دہشت گردوں کی اپنے چیف سے ملاقات رات بارہ بجے کے بعد کمرہ نمبر سات میں ہونی تھی۔ جب رات کے گیارہ سوا گیارہ بجے کا ٹائم ہوگیا تو میں راجہ بازار سے نکل کر مارگلہ ہوٹل کا پتہ پوچھ کر اس طرف روانہ ہوگیا۔ مارگلہ ہوٹل میں نے اس ہوٹل کا فرضی نام لکھا ہے۔ اگر آپ کو صحیح نام بتادوں گا تو اس ہوٹل کی بدنامی ہوگی۔ کیونکہ اس میں اس ہوٹل والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہاں تو مسافر آتے جاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی بھارتی ہندو مسلمان کا بھیس بدل کر وہاں آکر رات دو رات کے لئے ٹھہرتا ہے تو ہوٹل والوں کو کیا معلوم کہ وہ حقیقت میں بھارتی تخریب کار ہے۔

مجھے یقین تھا کہ ان دونوں تخریب کاروں کا چیف باس بھی بھارتی ہندو ہوگا جس کا تعلق مشرقی پنجاب کی انٹیلی جینس پولیس کی خصوصی برانچ سے ہوگا۔ کوئی مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال تھا۔ باقی چیف باس کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سننے کے بعد ہی صحیح بات کا علم ہو سکتا تھا۔ جس مشن پر میں جا رہا تھا وہ مجھے بے حد مشکل اور دشوار لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چیف ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ دونوں تخریب کار اس کے کمرے میں ہی ملاقات کرنے والے تھے۔ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ جس کی مدد سے میں اس کمرے کے اندر چھپ کر یا کسی دوسرے طریقے سے ان لوگوں کی گفتگو سن سکوں جس کو سننا بے حد ضروری تھا اور یہی میرا مشن بھی تھا۔ ان کی باتیں سن کر ہی مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا پاکستان میں خفیہ اڈہ کہاں پر ہے اور ان کے گروہ کے لوگ کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں اور اب یہ کس جگہ دھماکہ کرنے کا پروگرام بنا

رہے ہیں۔ میرے پاس پیسے بھی تھوڑے سے رہ گئے تھے۔ میں اس ہوٹل میں کوئی کمرہ
کرائے پر لے کر بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

اس کش مکش اور پریشان خیالات کے ساتھ میں مارگلہ ہوٹل کی دو منزلہ عمارت کے
سامنے پہنچ گیا یہ انگریزوں کے زمانے کا ایک پرانی وضع کا ہوٹل تھا جو کسی دو منزلہ کوٹھی کو
تبدیل کر کے بنایا گیا تھا۔ ہوٹل کی عمارت کی دونوں جانب کشادہ لان تھا جس میں پودے
اور درخت اگے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں ایک جانب کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔
میں نے ان گاڑیوں کو قریب جا کر دیکھا۔ ان میں تخریب کاروں کی ٹیوٹا گاڑی نہیں تھی۔
اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی ہوٹل میں نہیں پہنچے تھے۔ پنڈی اسلام آباد میں موسم سرد
تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کئے ہوئے تھے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی
مونچھوں اور گردن تک بڑھے ہوئے بالوں سے میں فلاسفر یا شاعر ٹائپ آدمی لگ رہا تھا۔
میں نے ہوٹل کے ایک ملازم سے پوچھا کہ یہاں کمرہ نمبر سات کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ
پیچھے پہلی منزل میں کونے والا کمرہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ ہوٹل کے کمروں میں اور لا
میں ضرور روشنیاں ہو رہی تھیں مگر ہوٹل کے لان میں اور ہوٹل کی بلڈنگ کے ارد گر
کہیں کہیں ہی بلب روشن تھا۔ میں ہوٹل کی کوٹھی کی پچھلی طرف آگیا۔ یہاں ایک چھ
سا برآمدہ تھا جو سردی اور رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بالکل خالی پڑا تھا۔ یہاں تی
کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ میں نے قریب جا کر ان کے نمبر پڑھے۔ ایک کمرے پر نمبر سا
لکھا ہوا تھا۔ سات نمبر کمرے کو تالا لگا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ اندر سے کوئی آو
نہیں آ رہی تھی۔ دونوں تخریب کار اور ان کا بھارتی چیف ابھی نہیں آئے تھے۔

ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے کے دروازے کی نا
کو گھمایا۔ وہ کھل گیا یہ کمرہ خالی تھا۔ پلنگ فرنیچر لگا ہوا تھا مگر کوئی آدمی وہاں نہیں تھ
شاید یہ کمرہ ابھی کرائے پر نہیں چڑھا تھا۔ میں نے دروازہ آہستہ سے بند کر کے کمرے
جائزہ لیا۔ کمرے کی بتی روشن تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ کمرے لکڑی کی دیواروں
پارٹیشن کر کے بنائے گئے ہیں۔ یہ اس پرانی کوٹھی کا کوئی ہال روم تھا جس کی پارٹیشن

کے تین کمرے بنا دیئے گئے تھے۔ میں نے اس دیوار کو انگلی سے بجایا جس کی دوسری
جانب سات نمبر کمرہ تھا۔ دیوار میں سے کھوکھلی آواز آئی۔ یہ لکڑی کی بھی نہیں بلکہ چپ
بورڈ کی دیوار تھی جس پر ہلکا سبز روغن کیا ہوا تھا۔ اتنے میں باہر سے کچھ آدمیوں کے باتیں
کرنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے کمرے کی بتی بجھادی اور دروازے کی ایک جانب
دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچا کہ اگر کوئی اس کمرے میں آ رہا ہے تو میں دروازہ
کھلتے ہی اندھیرے میں باہر نکل جاؤں گا۔ میں باتھ روم میں بھی چھپ سکتا تھا مگر پھر وہاں
سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ آوازیں اور قدموں کی آہٹیں برآمدے میں آ کر رک گئیں۔ کسی
نے تالے میں چابی لگائی۔ میں سمجھ گیا یہ لوگ ساتھ والے نمبر سات کمرے کے آدمی
تھے۔ یہ وہی بھارتی تخریب کار اور ان کا چیف ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے تین آدمیوں کی
مختلف آوازیں آئی تھیں۔ یہ لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے کو بند کر کے چٹخنی
لگا دی گئی۔

میں دروازے سے ہٹ کر دبے پاؤں چپ بورڈ کی اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا
ہو گیا جو دونوں کمروں کی مشترکہ دیوار تھی۔ دوسرے کمرے میں سے آدمیوں کے بولنے
کی آوازیں آنے لگیں۔ ان کے الفاظ بالکل صاف سمجھ میں آ رہے تھے۔ میں دونوں
بھارتی تخریب کاروں کی آوازوں اور ان کے امرتسری ہندوؤں کے لہجے کو پہچانتا تھا ان
میں ایک تیسری آواز بھی تھی جو ان کے بھارتی چیف کی آواز تھی۔ تیسری آواز نے
کمرے میں آتے ہی دونوں تخریب کاروں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”تم لوگوں کو امرتسر جاتے ہی نہ صرف نوکری سے الگ کر دیا جائے گا بلکہ تمہارے
خلاف کیس بھی چلے گا۔ تم بالکل نااہل ہو۔ تمہاری نااہلی کی وجہ سے پاکستان میں ہمارے
اگرواد کا سارا پروگرام خطرے میں پڑ گیا ہے۔ وہ بم ضرور پاکستانی پولیس انٹیلی جینس کے
ہاتھ آگیا ہے۔ اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

ایک تخریب کار نے کہا۔

”سر! میں تو تھیلا رکھ کر چلا آیا تھا اور سینما ہاؤس کی ایک طرف کھڑا اس کی نگرانی

بھی کر رہا تھا“

چیف نے اسے گالی دے کر کہا۔

”پھر تمہارا باپ وہاں سے تھیلا اٹھا کر لے گیا؟“

بھارتی دہشت گرد نے وہی جواز پیش کیا کہ اس کے پیٹ میں صبح سے درد ہو رہا تھا اسے دو منٹ کے لئے لیٹرین میں جانا پڑ گیا۔ اسی دوران کوئی تھیلے میں سے بم نکال کر لے گیا۔

”سر! مجھے معاف کر دیں۔ آگے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“

چیف کہنے لگا۔

”یہ بات اب میرے اختیار میں نہیں ہے۔ سارا معاملہ کرنل چڈہ کے ہاتھ میں ہے وہ اس معاملے کی تفتیش کے لئے یہاں پہنچ رہا ہے۔ ایک گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ وہی اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ تمہیں واپس امرتسر بھجوانا ہے یا کیا کرنا ہے؟“

دوسرے دہشت گردی نے کہا۔

”سر! کیا یہ کرنل چڈہ صاحب ضلع روہتک کے رہنے والے ہیں؟“

چیف نے کہا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ انڈین ملٹری انٹیلی جینس کا بڑا افسر ہے۔ اور پاکستان میں ہماری اگرواد کی تخریبی کارروائیوں کا انچارج ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کی شکل صورت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف کام دے دیا جاتا ہے۔ صرف آرڈر ملتے ہیں۔ مگر یہ خاص واقعہ ہوا تھا اس لئے مجھے کرنل چڈہ کو فون پر خفیہ لفظوں میں خبر دینی پڑی کہ مارکیٹ والا بم نہیں پھٹا۔ اس نے کہا کہ وہ آج رات ایک بجے تک ہمارے پاس پہنچ رہا ہے“

پہلے بھارتی تخریب کار نے کہا۔

”سر! ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ جو آدمی ہمارے پاس آیا ہے وہی کرنل چڈہ صاحب ہیں“

چیف نے کہا۔

”ہمارا ایک خاص پاس ورڈ ہے۔ اسے تم بھی سن لو۔ اگر میں اس وقت باتھ روم میں ہوا تو تم آنے والے سے پاس ورڈ پوچھنا۔ پاس ورڈ تاج محل ہے۔ اس کے بعد وہ تم سے پوچھے گا۔ کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ تم آگے سے کہو گے کہ رانی صاحبہ صبح مر گئی ہیں۔ اس کے جواب میں وہ کہے گا۔ ٹھیک ہے۔ مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلیں۔ اس کے بعد ثابت ہو جائے گا کہ یہی کرنل صاحب ہیں سمجھ گئے ہو یا نہیں؟“

بھارتی تخریب کاروں نے آہستہ سے بیک آواز کہا۔

”سمجھ گئے ہیں سر!“

جس کمرے میں میں دیوار کے ساتھ کان لگائے بھارتی تخریب کاروں کی باتیں سن رہا تھا اس کمرے میں دیوار کے ساتھ ایک کلاک لگا ہوا تھا۔ مگر میں نے چونکہ بتی بجھا دی تھی اس لئے دور سے مجھے اس کی سوئیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اور مجھے وقت معلوم کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ میں نے آہستہ سے کلاک کے نیچے کرسی رکھی اور اس پر کھڑے ہو کر ذرا قریب سے کلاک کو دیکھا۔ اس کی سوئیاں چمک رہی تھیں اور معلوم ہوا کہ رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ گویا ابھی کرنل چڈہ کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے اپنا ایکشن جلدی شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا بھارتی انٹیلی جینس کے کرنل چڈہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے کر دینا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ دوسرے کمرے میں تینوں تخریب کار اپنے اگلے تخریبی پروگرام کے بارے میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ میں ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ صرف تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد میں اس خالی اور اندھیرے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرہ نمبر سات کے بند دروازے کے سامنے آ گیا اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

اندر باتیں کرنے کی دھیمی آواز آنا بند ہوگئی۔ پھر کسی نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔

"کون ہے؟"

یہ تیسرے بھارتی تخریب کار یعنی چیف کی آواز تھی۔ میں نے بڑے پرسکون اور بارعب آواز میں کہا۔

"کیا چیف اندر ہے؟"

دوسری طرف ایک سیکنڈ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر چیف نے کہا۔

میں چیف بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں کرنل چڈھہ ہوں۔ دروازہ کھولو"

چیف نے کہا۔

"تمہارا پاس ورڈ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں؟"

چیف کی آواز آئی۔

"مہارانی صاحبہ صبح مر گئی ہیں۔"

مجھے سارا کوڈ زبانی یاد تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلو"

اس کے فوراً بعد دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے ایک دبلا پتلا پختہ عمر کا آدمی کھڑا تھا جس نے شلوار قمیض کے اوپر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کی عینک لگی تھی۔ اس کے پیچھے وہی دونوں بھارتی ہندو تخریب کار ایک طرف ہو کر کھڑے تھے۔ جنہیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جن میں سے ایک وہ تھا جس نے اسلام آباد مارکیٹ کی کتابوں کی دکان کے باہر سے بم والا خالی تھیلا اٹھایا تھا اور دوسرا وہ تھا جو اسے راولپنڈی

کی پرانی بستی والے مکان میں ملا تھا اور جس کو میں نے پہلے تخریب کار کے ساتھ مکان سے باہر نکل کر کھیتوں میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ میں جلدی سے اندر داخل ہوگیا اور بڑے رعب سے کہا۔

"دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دو۔ تم لوگوں نے کمرے میں اتنی روشنی کیوں کر رکھی ہے؟"

چیف نے جلدی سے صوفے پر سے اخبار ہٹاتے ہوئے ایک تخریب کار سے کہا۔

"رام چند! ایک بتی بجھا دو"

ایک بتی بجھا دی گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور ان تینوں کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد چیف سے پوچھا۔

"بم کا تھیلا کس نے رکھا تھا؟"

چیف کی شکل چونکہ نئی تھی اور اس کی آواز سے بھی میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہی چیف ہے۔ اس نے ایک تخریب کار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس نے رکھا تھا سر!"

"اس کا نام کیا ہے؟"

چیف نے بتایا۔

"شری ناتھ سر!"

تخریب کار شری ناتھ کا رنگ اڑ گیا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غضبناک آواز میں کہا۔

"میں دیکھوں گا تمہیں کس نے امرتسر سنٹر سے پاس کر کے اس مشن پر بھیجا تھا۔ میں تمہارے ساتھ اسے بھی امرتسر جاتے ہی ڈس مس کر دوں گا۔"

شری ناتھ گڑگڑاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں ایک منٹ کے لئے لیٹرین میں چلا گیا تھا سر۔ میرے پیٹ میں سخت درد تھا۔"

"شٹ اپ!" میں نے اسے جھاڑ دیا۔

"پھر چیف کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"امرتسر سنٹر کو میں نے تمہارے مشن کی ناکامی کی اطلاع دی ہے۔ مجھے ان کے اگلے فیصلے کا انتظار ہے۔ مجھے بتاؤ ہمارا اگلا مشن نمبر کیا تھا اور ہمارے باقی آدمی اس وقت کہاں ہیں تاکہ اس مشن کی ناکامی کے بعد میں انہیں نئی ڈائریکشن دے سکوں۔ امرتسر سنٹر سے مجھے وائرلیس پیغام میں بتایا ہے کہ باقی آدمیوں کی بابت چیف کو معلوم ہے۔"

چیف نے جلدی سے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

"لیس سر! میں ابھی بتاتا ہوں"

پھر اس نے ڈائری میں سے ایک کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر اسے پڑھتے ہوئے کہا۔

"سر! اس وقت ہمارے صرف دو اگروادی (تخریب کار) پاکستان میں ہمارے علاو ہیں۔ دونوں اس وقت کراچی میں ہیں سر۔ ان کی ڈیوٹی اگلے ہفتے کراچی ریلوے اسٹیشن پر دو دھماکے کرنے اور ایک مسجد کے نمازیوں پر فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کرنے کی ہے۔ اس کاغذ پر ان کے نام اور ایڈریس لکھے ہوئے ہیں سر!"

میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے دے دو"

کاغذ کے پرزے پر دو آدمیوں کے ہندو نام اور نیچے کراچی کا کوئی ایڈریس لکھا ہوا تھا جو میں نے اس وقت نہ پڑھا اور کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے چیف کو ڈانٹ کر کہا۔

"سنٹرل انٹیلی جینس تمہارے خلاف بھی ایکشن لے گی۔ آخر تم لوگوں کو ہماری بھارتی حکومت نے اس لئے یہاں بھیجا ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر جنتا کی کمائی سے عیش اڑاؤ؟"

چیف کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ! تم سب بیکار آدمی ہو۔ میں نے امرتسر سنٹر کو وائرلیس پر بریف کر دیا

ہے کہ تم تینوں کو واپس بلا لیا جائے۔ اب میں جاتا ہوں۔ تم لوگ اس وقت تک یہیں رہو گے جب تک مجھے امرتسر سنٹر سے کوئی ایڈوائس نہیں ملتی۔ او کے؟"

"لیس سر!"

چیف نے مردہ سی آواز میں کہا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں امرتسر سنٹر وائرلیس میسج کا جواب لینے جاتا ہوں۔ دروازے کو اندر سے بولٹ کر کے رکھنا اور خبردار کمرے میں زیادہ روشنی نہیں ہونی چاہئے۔"

"لیس سر!"

چیف یہ کہہ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دروازے کے پاس جا کر پلٹ کر کہا۔

"تمہارے پاس پاکستانی کرنسی میں ایک ہزار روپیہ ہوگا؟"

چیف نے جلدی سے اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے میں سے سو سو کے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔

"سر! یہ سات سو پاکستانی روپے ہیں سر"

"ٹھیک ہے" میں نے روپے لے کر کہا۔ "میرے پاس دس ہزار کی انڈین کرنسی ہے۔ مجھے تمہارے پاس جلدی آنا پڑا۔ پاکستانی کرنسی میں اس رقم کو تبدیل نہیں کرا سکا۔"

"نو پرابلم سر!"

میں نے چیف کی طرف گھور کر دیکھا۔

"زیادہ انگریزی مت بولا کرو۔ پاکستان میں رہتے ہو تو اردو میں بات کیا کرو"

یہ کہہ کر میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں رک گیا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ چیف نے دروازہ بند کیا اور اندر سے بولٹ کر دیا۔ میں وہاں سے سیدھا ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ یہاں ایک جانب کونے میں چھوٹا سا ٹیلی فون بوتھ بنا ہوا تھا۔ بوتھ میں داخل ہوتے ہی ساتھ لگی ہوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ایمرجنسی پولیس کا نمبر تلاش

کرنے لگا۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے میں نے ایمرجنسی پولیس کا نمبر اس لئے نہ پوچھا کہ وہاں خواہ مخواہ کا خوف وہراس نہ پھیل جائے اور تینوں تخریب کار کمرے سے فرار نہ ہو جائیں۔

مجھے بڑی جلدی ایمرجنسی پولیس فورس کا نمبر مل گیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ایمرجنسی پولیس فورس سر! کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔

"میری بات غور سے سنو! میں تمہیں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔"

میں پنڈی کے مارگلہ ہوٹل کی لابی سے بول رہا ہوں۔ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں اس وقت انڈیا کے تین ہندو تخریب کار موجود ہیں۔ انہیں فوراً پولیس سکواڈ بھیج کر گرفتار کیا جائے۔ دیر نہیں ہونی چاہئے ہو سکتا ہے وہ آدھے گھنٹے کے اندر یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

دوسری طرف سے پولیس اہلکار نے کہا۔

"فکر نہیں کریں سر۔ ہم ابھی پولیس گارڈ بھیج رہے ہیں۔"

میں نے فوراً فون بند کر دیا۔ میں ہوٹل کی عمارت سے نکل کر سامنے والی سڑک کی دوسری جانب رات کے اندھیرے میں درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں ان لوگوں کا سرغنہ اصلی کرنل چڈہ پولیس گارڈ پہنچنے سے پہلے ہی وہاں نہ پہنچ جائے۔ پھر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان لوگوں پر ساری بات کھل جاتی اور وہ ہوٹل کی دوسری طرف سے رات کے اندھیرے میں فرار ہو سکتے تھے۔ میں تخریب کاروں کے سرغنہ کرنل چڈہ کو بھی پکڑنا چاہتا تھا لیکن ان تخریب کاروں کی گرفتاری کے بعد پہلے وہاں ایسا موقع نہیں بن رہا تھا۔

پنڈی ایمرجنسی پولیس نے انتہائی مستعدی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا اور دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ پولیس کی دو گاڑیاں ہوٹل میں داخل ہوتی نظر آئیں بڑی

خاموشی سے دونوں گاڑیاں لان کی ایک جانب درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑی ہوئیں۔ میں نے ان میں سے پندرہ سولہ پولیس کے مسلح سپاہیوں کو چھلانگیں لگا کر نکلتے دیکھا۔ چھ سات سپاہی ہوٹل کی دونوں جانب دوڑ پڑے تاکہ ہوٹل کا محاصرہ کیا جائے چار سپاہی وہیں بندوقیں لئے کھڑے ہو گئے۔ کچھ سپاہی ایک تھانیدار کی جمعیت میں ہوٹل کی لابی میں گھس گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کے عقب میں کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ فائر کی آواز بھی آئی۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ شاید کسی تخریب کار نے فائر کیا تھا۔ یا پولیس انسپکٹر نے فائر کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ پولیس کے آدمی تینوں تخریب کاروں کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ انہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں پولیس کی بھاری نفری نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ تینوں تخریب کاروں کو پولیس نے گاڑی میں دھکیلا اور گاڑیاں ہوٹل کی عمارت سے نکل کر سڑک پر ایک طرف روانہ ہو گئیں۔

میری تسلی ہو گئی۔ میں اس لئے بھی خوش تھا کہ یہ کارروائی بڑی جلدی ہو گئی تھی اور تینوں بھارتی تخریب کاروں کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ چیف تخریب کار نے بتایا تھا کہ کرنل چڈہ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچنے والا ہے۔ ابھی اس بات کو میرے اندازے کے مطابق ایک گھنٹہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل چڈہ ابھی تک وہاں نہیں آیا ہوگا۔ میں درختوں کے پیچھے سے نکل کر ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ وہاں دو تین آدمی کھڑے اس واقعے پر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ایک ملازم سے ہوٹل کے فلور منیجر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کاؤنٹر کے پاس ایک سوٹ بوٹ والے نوجوان آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی ملک صاحب وہ سامنے کھڑے ہیں"

میں اس کے پاس چلا آیا۔ میں نے اسے سلام علیکم کہا اس نے چونک کر میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا آپ ہی فلور منیجر ہیں؟"

اس نے بے دلی سے کہا۔

"جی ہاں۔ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

ہوٹل پر چھاپہ پڑنے کی وجہ سے وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"میرا نام راجہ غلام سرحد ہے۔ میں پنڈی انٹیلی جینس کا پولیس انسپکٹر ہوں۔ ہمیں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ جس کمرے میں انڈین تخریب کار ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں ان کا ایک چیف بھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے"

فلور منیجر نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"سر! ہماری پہلے ہی بڑی بدنامی ہو چکی ہے۔ آپ کی پولیس تین آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"میں نے کہا"۔

"لیکن ان کا چیف باہر سے آنے والا ہے اور کمرہ نمبر سات میں ہی ان سے آکر ملے گا۔ اس کا نام کرنل چڈھ ہے۔ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی کا آدمی ہے۔ اور اس کا پکڑا جانا نہایت ضروری ہے۔ میرے ساتھ پولیس کے چار مسلح سپاہی بھی ہیں جو درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں اور میرے خاص اشارے کے منتظر ہیں۔"

فلور منیجر نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ آپ جو کہتے ہیں ہم ویسے ہی کریں گے۔"

"میں نے کہا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں آپ کے سوا کسی دوسرے کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں کمرہ نمبر سات میں چھپ کر بیٹھوں گا۔ کیونکہ بھارتی کرنل چڈھ ہماری اطلاع کے مطابق اسی کمرے میں اپنے ساتھیوں سے ملنے آرہا ہے۔ اس کے بعد ہم اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے"

فلور منیجر نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"سر! میں ایک ہی گزارش کروں گا۔ کہ اب کوئی فائرنگ وغیرہ نہیں ہونی چاہئے

آپ خاموشی سے اس تخریب کار کو پکڑ کر لے جائیں"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ مجھے جلدی سے کمرہ نمبر سات کھول دیں۔"

فلور منیجر نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ کاؤنٹر پر جاکر کمرہ نمبر سات کی چابی لی جسے تخریب کاروں کی گرفتاری کے بعد مقفل کر دیا گیا تھا اور مجھے ساتھ لے کر پیچھے سے ہوتا ہوا کمرہ نمبر سات میں لے آیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"سر! ایک مہربانی کریں کہ یہ جو تخریب کار باقی رہ گیا ہے اسے گرفتار کر کے بس یہاں سے لے جایئے گا۔ کوئی فائرنگ وغیرہ نہ ہو"

میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ اب چلے جائیں اور ہرگز ہرگز کسی سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔"

فلور منیجر چلا گیا۔ میں نے کمرے کی بتی جلا کر دروازہ بند کر لیا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ تخریب کاروں کے سرغنہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے آدمی پکڑے گئے ہیں تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ کرنل چڈھ کو یہاں جو کارروائی ہو چکی تھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے میں نے کمرے کی چیزوں کو درست کیا اور جیکٹ کا اوپر والا بٹن کھول کر بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے کسی نے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں چیف ہوں"

باہر سے آواز آئی۔

"میں تمہارا افسر ہوں"

میں نے کہا۔

"اپنا پاس ورڈ بتاؤ"

اس نے کہا۔

"کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جس بدبخت بھارتی دہشت گرد کا مجھے انتظار تھا وہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"مہارانی صاحبہ صبح مرگئی ہیں"

دوسری طرف سے آواز آئی

"مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلو"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک دراز قد کا مگر دبلے بدن کا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے بھورے رنگ کا گرم سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر قراقلی ٹوپی تھی۔ میں نے اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اندر آتے ہی جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور پوچھا۔

"باقی دونوں کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"سر! آپ کرنل چڈھ صاحب ہے ناں؟"

اس نے کھڑے کھڑے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"ہاں۔ مگر تمہارے دونوں اگروادی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"سر! ایک ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے۔ میں ساری بات آپ کو ابھی بتاتا ہوں۔ آ یہاں بیٹھ جائیں؟"

اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں چیف ہوں۔ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس لئے آپ مجھے پہچان نہیں رہے۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا پولیس کو پتہ چل گیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں سر! ہم اگروادی اتنے کچے نہیں ہیں سر۔ بس ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ پولیس کسی دوسری واردات کی تفتیش کرنے یہاں ایک کمرے میں آئی ہوئی ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تب تو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا میں نے اپنا الٹا بازو پوری طاقت سے اس کی گردن کے پیچھے مارا۔ میرے فولادی بازو کی ضرب ایک ہتھوڑے کی طرح اس کی گردن پر پڑی وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کے گرتے ہی اس پر چھلانگ لگادی اور اس کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر زور سے اوپر کو جھٹکا دیا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑگیا۔ میں نے پوری طاقت سے ایک اور جھٹکا دیا۔ مگر میرے پہلے جھٹکے نے ہی اس کی گردن کا منکا توڑ کر اس کا کام تمام کردیا تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک رومال سگاروں کا پیکٹ' لائٹر اور ایک بٹوہ نکلا جس میں دوہزار روپے کی پاکستانی کرنسی تھی۔ سات سو روپے میرے پاس پہلے تھے۔ یہ دوہزار روپے کے نوٹ بھی میں نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اس کے بٹوے میں اور کچھ نہ نکلا۔ یہ لوگ ایسی کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھتے جس سے ان کے گروہ کے دوسرے لوگوں کا سراغ مل سکے۔ اس کے پاس کوئی چاقو پستول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کی لاش کو

وہیں پڑا رہنے دیا اور خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب مجھے کراچی کے ان دو بھارتی تخریب کاروں کو ٹھکانے لگانا تھا جن کے نام اور کراچی کا ایڈریس والا کاغذ میری جیب میں تھا۔ میں ہوٹل کی پچھلی طرف سے ہو کر باہر سڑک پر آ گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ سڑک دور تک خالی پڑی تھی۔ رات سرد تھی۔ راولپنڈی کی راتیں نومبر میں بھی کافی سرد ہو جاتی ہیں۔ میں نے جیکٹ کے اوپر والا بٹن بند کر لیا اور جیبوں میں ہاتھ دے کر سڑک پر چل پڑا۔

اس بات کا امکان تھا کہ چونکہ اس علاقے میں بھارتی تخریب کار پکڑے گئے تھے ہو سکتا تھا کہ سی آئی ڈی کے آدمی اس طرف چھپے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو بھی پولیس سے بچانا تھا۔ کیونکہ پنجاب کی پولیس کو میری بھی تلاش تھی۔ میں سڑک پر چلتے چلتے چوک میں آیا تو ایک طرف سے ٹیکسی آ رہی تھی۔ اس کی سرخ بتی روشن تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹیکسی خالی ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اور ڈرائیور سے ایئرپورٹ چلنے کو کہا۔ اس وقت تک اسلام آباد کے ایئرپورٹ سے صرف اندرون ملک ہی پروازیں آتی جاتی تھیں۔ بیرون ملک کی پروازیں کراچی ایئرپورٹ سے روانہ ہوتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ ایئرپورٹ میرے لئے محفوظ جگہ ہے۔ میرے پاس کافی رقم موجود تھی۔ اس زمانے میں ڈھائی تین ہزار کی رقم بہت زیادہ رقم ہوتی تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ شاید وہاں سے کراچی جانے والی کوئی نائٹ کوچ کی فلائٹ مل جائے۔ ایئرپورٹ پر آ کر معلوم ہوا کہ کراچی جانے والی نائٹ کوچ رات ایک بجے چلی گئی تھی اب صبح چھ بج کر پینتالیس منٹ پر ایک فلائٹ کراچی جائے گی۔ میں ایئرپورٹ کی عمارت میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے چار پانچ گھنٹے وہاں بیٹھنا تھا۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیند پر قابو پانا میری ٹریننگ میں شامل تھا۔ صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کسی پولیس والے کی نگاہ میں نہ آ جاؤں۔ مگر وہاں مجھے ایک بھی پولیس کا سپاہی نظر نہ آیا۔

کسی نہ کسی طرح میں نے رات ایئرپورٹ پر گزار دی۔ دن نکل آیا۔ نومبر کی صبح اسلام آباد میں سرد اور دھندلی تھی۔ ایئرپورٹ کے باہر ایک ٹریولنگ ایجنسی کے آفس سے

مجھے کراچی کا ٹکٹ مل گیا۔ ابھی جہازوں میں لوگوں کا اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں کے پاس ابھی نہ تو اتنا پیسہ آیا تھا اور نہ دولت کا زیادہ لالچ ہی تھا۔ مجھے جہاز میں بڑی آسانی سے جگہ مل گئی۔ اپنے وقت پر جہاز کراچی کی طرف پرواز کر گیا۔ کراچی پہنچنے پر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لئے نئی پتلون قمیض اور جوتے خریدے انہیں ایک لفافے میں ڈال کر شہر کے ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ ڈاڑھی مونچھوں اور سر کے بال ہلکے کروائے۔ نہا دھو کر پرانے کپڑے سوائے جیکٹ کے پھینک دیئے اور نئے کپڑے پہن لئے۔ اس دوران میں نے کاغذ پر لکھے ہوئے دونوں بھارتی تخریب کاروں کے نام اور ان کا ایڈریس پڑھ لیا ہوا تھا۔ یہ وہاں مسلمانوں کے نام سے رہ رہے تھے۔ لیکن کاغذ پر ان کے ہندوانہ نام بھی بریکٹ میں لکھے ہوئے تھے۔ اس طرح ان لوگوں کو اعتماد میں لینے کے لئے میرے لئے آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ راولپنڈی کے تخریب کار گرفتار ہو چکے تھے۔ وہاں سے اب انہیں وائرلیس یا ٹیلی فون پر کوئی میرے بارے میں خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے ملنا اور ان سے پاکستان میں مقیم دوسرے بھارتی دہشت گردوں کا کے سراغ لگا کر ان سب کو پولیس کے حوالے کرنا تھا۔

دن کے نو بجے کے قریب میں رکشے میں بیٹھ کر اس علاقے کی طرف روانہ ہوا جہاں یہ بھارتی تخریب کار مسلمان بن کر رہ رہے تھے۔ ان کے مکان کا ایڈریس کاغذ پر لکھا تھا۔ معلوم نہیں تھا وہ دونوں اکٹھے وہاں رہتے تھے یا ان میں سے ایک تخریب کار وہاں رہتا تھا۔ یہ مجھے وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ جس علاقے کا ایڈریس کاغذ پر لکھا ہوا تھا وہ کراچی شہر کے شمال میں سمندر کے قریب ایک چھوٹی سی مزدور بستی تھی۔ کوارٹر نما غریبانہ مکان ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔ ایک مختصر سا بازار تھا جہاں دکانیں کھلی تھیں۔ میں ایک چائے کی دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ مکان کا نمبر مجھے یاد تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے چائے کی دکان کے مالک کو مکان کا نمبر بتا کر پوچھا کہ یہ مکان کس طرف ہے۔ اس نے ذرا آگے کو ہو کر بائیں طرف کوارٹروں کے درمیان سے گزرتی کچی سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جہاں سڑک دائیں طرف مڑتی ہے یہ مکان اس طرف تیسرا ہے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے بابو؟"

میں نے ایک بھارتی تخریب کار کا مسلمانوں والا نام بتایا تو دکاندار بولا۔

"اچھا تو آپ کو ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے؟"

ایڈریس جو کاغذ پر لکھا تھا وہاں اس تخریب کار کے اسلامی فرضی نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب سے ہی ملنا ہے"

دکاندار نے لڑکے کو بلا کر کہا۔

"جا بے صاحب کو ڈاکٹر اللہ یار کی دکان پر چھوڑ آ"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا"

میں نے چائے کے پیسے دیئے اور کوارٹر نما ایک منزلہ شکستہ سے مکانوں کے درمیان جو کچی سڑک بنی ہوئی تھی اس پر چلنے لگا۔ آگے جا کر سڑک ایک طرف کو مڑ گئی۔ ادھر تیسرے مکان کے باہر میں نے دو عورتوں کو جو لباس سے مزدور لگتی تھیں زمین پر بچوں کو لئے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا دکان کے قریب آ گیا۔ دیکھا کہ دکان کی پیشانی پر بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا۔

ڈاکٹر اللہ یار ہومیو پیتھک یہاں ہر مرض کا علاج کیا جاتا ہے۔

دکان کے اندر ایک چھوٹی سی ڈاڑھی والا آدمی میز کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک مریض اس کے پاس سٹول پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے سینے پر سٹیتھو سکوپ لگائی ہوئی تھی۔ پرانی بوسیدہ سی دکان تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ الماری میں ہومیو پیتھی دوائیوں کی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک چارٹ بھی لگا تھا جس پر انسانی جسم ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ دو تین مریض سامنے دیوار کے ساتھ بنچ پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کی عمر چالیس کے قریب ہو گی۔ بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ بدن اکہرا تھا۔ آنکھوں پر سفید شیشوں والی عینک

لگی تھی۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ بھورے رنگ کی پرانی اچکن پہن رکھی تھی۔ میں بھی دکان کے اندر جا کر مریض بن کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مریض کے سینے سے اس نے سٹیتھو سکوپ ہٹا کر میز پر رکھ دی اور اس کے لئے پڑیاں بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کو ہدایات بھی دیتا جاتا تھا۔ یہ شخص شکل وصورت سے کسی طرح بھی بھارتی تخریب کار نہیں لگ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے بھی اس کو دیکھ کر شک ہونے لگا کہ کہیں میں کسی دوسرے آدمی کے پاس تو نہیں آ گیا۔ لیکن پنڈی کے مارگلہ ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں بھارتی تخریب کاروں کے چیف نے مجھے جو کاغذ دیا تھا اس پر اس شخص کے ہندوانہ نام بھگت رام کے آگے بریکٹ میں اللہ یار ہی لکھا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ کاغذ پر اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھا گیا تھا۔ دوسرے تخریب کار کا ہندوانہ نام میلا رام تھا اور اس کے نام کے آگے مسلمانوں والا نام بریکٹ میں عبدالستار لکھا ہوا تھا۔

دو تین مریض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر اللہ یار میری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کیسے آئے ہو بھائی؟"

اس کا اردو بولنے کا لہجہ بڑا عامیانہ اور مزدوروں والا تھا۔ شاید اس مزدور بستی میں رہنے کی وجہ سے ایسا تھا۔ میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بخار میرا پیچھا نہیں چھوڑتا میں راولپنڈی سے آپ کی شہرت سن کر آیا ہوں۔"

میں نے ہاتھ آگے کیا کہ وہ شاید نبض دیکھے گا مگر اس نے سٹیتھو سکوپ میرے سینے پر لگائی۔ تین چار سیکنڈ خاموشی سے آنکھیں بند کئے جیسے غور کرتا رہا۔ پھر سٹیتھو سکوپ میز پر رکھ دی اور بولا۔

"بھائی تمہیں اس وقت کوئی بخار نہیں ہے"

میں نے کہا۔

"اسی طرح ہوتا ہے جی۔ ایک دن چڑھتا ہے۔ پھر دو دن نہیں چڑھتا۔ اس کے بعد

رات کو پھر بدن پھکنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ پچھلے دو مہینوں سے چل رہا ہے۔ پنڈی، پشاور،
لاہور میں بھی ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کسی کی دوائی سے آرام نہیں آیا۔ آخر ایک ریٹائرڈ فوجی
چڈہ صاحب نے آپ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ اب آپ کے پاس آگیا ہوں۔"

چڈہ کا نام سنتے ہی میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ٹھٹھک سا گیا تھا۔ وہ کوئی کتاب کھول کر
میرے مرض کے بارے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ چڈہ کا نام میری زبان سے سننے کے بعد
اس نے کتاب بند کردی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھائی تمہاری بیماری کی وجہ معلوم نہیں ہو رہی تم پیچھے کمرے میں چل کر بیٹھو
تمہارا پورا چیک اپ کرنا پڑے گا۔"

میں اٹھ کر دکان کے پیچھے چھوٹے سے کمرے بلکہ کوٹھڑی میں آکر مونڈھے پر بیٹھ
گیا۔ یہاں زمین سے کوئی دو فٹ اونچا میلا کچیلا سٹریچر پڑا تھا۔ دیواریں خالی تھیں۔ پچھلی
طرف جو کھڑکی کھلتی تھی اس کی سلاخوں میں سے تازہ ہوا اور دن کی روشنی آرہی تھی۔
کوئی پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر یعنی بھارتی تخریب کار کوٹھڑی میں آگیا۔ آتے ہی اس نے
دروازہ بند کردیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

سٹریچر پر لیٹ جاؤ۔ تمہارا پورا چیک اپ کرنا ہوگا۔

صاف لگ رہا تھا کہ میرے بارے میں اس کو پوری تسلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ چڈہ کوئی
اور فوجی بھی ہوسکتا تھا۔ یہ شخص بڑا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بھگت رام! میں کرنل چڈہ سے راولپنڈی میں مل کر آرہا ہوں۔ تمہارے واسطے
ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔"

وہ میرے سامنے سٹریچر پر بیٹھ گیا اور مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ مزید تصدیق
چاہتا تھا کہنے لگا۔

"کرنل چڈہ تمہیں کس جگہ ملا تھا؟"

مجھے ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں اخبار میں پنڈی مارگلہ ہوٹل سے پکڑے جانے والے
بھارتی تخریب کاروں کی خبر اخباروں میں نہ آگئی ہو۔ لیکن پنڈی پولیس نے عقلمندی

بوت دیا تھا۔ اس نے اخبارات کو یہ خبر ابھی نہیں بتائی تھی۔ کیونکہ اس طرح سے
وسرے تخریب کاروں کے روپوش ہو جانے کا امکان تھا اور پنڈی پولیس گرفتار شدہ
ینوں تخریب کاروں سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

"وہ مجھے مارگلہ ہوٹل میں ملا تھا۔ میں وہاں اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ساتھ
وجود تھا۔ ہمارا چیف بھی وہیں پر تھا"

میں نے اسے مارگلہ ہوٹل والے اور تخریب کاروں کے ہندو نام بتائے۔ اس کے
اوجود اس شخص نے مجھے ہاتھ نہ پکڑایا کہنے لگا۔

"مارگلہ ہوٹل میں کل رات کا پاس ورڈ کیا تھا؟"

میں نے اسے وہ سارا مکالمہ زبانی سنادیا جس میں تھا کہ کیا مہارانی اسی کمرے میں
ٹھہری ہوئی ہے؟ اور یہ کہ مجھے مہارانی کی ارتھی کے پاس لے چلو۔ اس کے ساتھ ہی میں
نے جیب سے کاغذ کا وہ پرزہ نکال کر اس کو دکھایا۔ جس پر چیف کے ہاتھ سے اس کے اور
کراچی میں مقیم دوسرے ہندو تخریب کار کا نام اور ان کا ایڈریس درج تھا۔ وہ کاغذ پر
لکھی ہوئی تحریر غور سے پڑھنے لگا۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ میں ان کا ساتھی ہی ہوں
کہنے لگا۔

"کرنل نے کیا پیغام دے کر تمہیں یہاں بھیجا ہے؟ کوئی چنتا والی بات تو نہیں ہے؟"
میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کرنل چڈہ نے مجھے جو پیغام دیا ہے وہ میں میلا رام کے
بھی سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا دوسرا ساتھی میلا رام کہاں رہتا ہے؟"

بھگت رام عرف اللہ یار کہنے لگا۔

"وہ شپ یارڈ میں مزدوروں کا میٹ لگا ہوا ہے۔ رات کو میرے مکان میں آکر سوتا
ہے۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"میری دکان کے اوپر ہے۔"

اس بھارتی تخریب کار نے مجھے بتایا کہ اس کا ساتھی جس کا اصلی نام میلارام تھا اور
عبدالستار کے نام سے کراچی شپ یارڈ میں کام کر رہا تھا رات کو آئے گا۔ میں نے کہا۔
"تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کے بارے میں امرتسر سنٹر کی طرف
سے یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ کہاں کہاں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور ان کی
تعداد کتنی ہے۔ ہمیں چیف کی طرف سے جب کسی سے رابطہ پیدا کرنے کا آرڈر ملتا ہے ت
ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں۔ کرنل چڈہ صاحب نے مجھے زبانی آرڈر دیا تھا کہ ا
کا خاص پیغام کراچی میں کام کرنے والے اپنے تمام آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک
بار سنا دیا جائے اس لئے اگر کراچی میں میلارام کے علاوہ اپنے جو آدمی ہیں ان کو بھی یہ
رات کو بلوا لینا۔ میں سب کے سامنے کرنل صاحب کا آرڈر سناؤں گا جو امرتسر کے سنٹ
طرف سے انہیں ملا ہے۔"
بھگت رام عرف اللہ یار کو اب یقین ہو گیا تھا کہ میں بھی ان کا ساتھی ہوں۔ میں
اسے اپنا نام پرکاش چند بتایا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ معلومات حا
کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار ہمارا ایک دوسرے کو پاس ورڈ اور
اشارے بتا دینا ہی کافی تھا۔ یہ باتیں مجھے مارگلہ ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں بھارتی
کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں۔
بھگت رام کہنے لگا۔
"ہم دو آدمی ہی کراچی شہر کی ڈیوٹی پر ہیں۔۔ ہم چار دھماکے کر چکے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔
"تم لوگوں کو کراچی کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے والوں پر بھی فائرنگ کرنی ہے اور
کراچی ریلوے سٹیشن پر بھی دھماکہ کرنا ہے۔"
یہ خاص خفیہ رپورٹ تھی جو مجھے ان کے چیف کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ میری اس
خفیہ رپورٹ نے اس بات پر تصدیق کی مہر لگا دی کہ میں ان کا ساتھی ہوں اور کرنل چڈہ
کا خاص آدمی ہوں۔ بھگت رام بولا۔
"یہ دونوں گھٹنائیں ہم اگلے ہفتے کرنے والے ہیں۔"
بھگت رام نے اپنی گفتگو میں اب ہندی کے الفاظ بولنے شروع کر دیئے تھے۔ میں
نے اسے ٹوک کر کہا۔
"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ پاکستان میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی یہاں کی
زبان میں بات کرتے ہیں؟ ہندی کے الفاظ مت استعمال کرو"
بھگت رام نے فوراً معذرت پیش کی اور کہا۔
"غلطی ہو گئی سر۔"
وہ مجھے اپنے بھارتی تخریب کاروں کے گینگ کا کوئی افسر سمجھنے لگا تھا۔ میں ان کے
پورے گینگ کا، پورے گروہ کا سراغ لگا کر انہیں ختم کرنا چاہتا تھا جو بھارتی حکومت کی
اسلام دشمن ایجنسی را کے اشارے پر پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر کے مسلمانوں کے
مذہبی فرقوں میں نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ یہ لوگ سنیوں کی مسجد میں بم مار
کر نمازیوں کو شہید کرتے تھے تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کام شیعوں نے کیا ہے۔ اس
طرح اگر کسی شیعہ مسجد میں بم کا دھماکہ ہوتا تھا تو وہ لوگ اس کا الزام سنیوں پر دھرتے
تھے۔ حالانکہ یہ کام بھارتی دہشت گرد کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"کیا اتنے بڑے شہر میں تم صرف دو آدمی یہ کام کر رہے ہو؟"
بھگت رام بولا۔
"ایک ہندو عورت مایاوتی ہمارے گینگ میں ضرور شامل ہے مگر وہ اگرواد کارروائیوں

میں ہمارے ساتھ نہیں جاتی"

میں نے اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا۔

"تم نے پھر ہندی لفظ اگر واد بولا۔ دہشت گردی کی کارروائیاں کہو"

"سوری سر! سوری"

"تو پھر یہ ہندو عورت مایاوتی کس کام کے پیسے لیتی ہے؟ بھارتی حکومت کیا اسے مف
کی تنخواہ دیتی ہے؟"

بھگت رام نے فوراً کہا۔

"نہیں سر ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل مایاوتی وہ کام کرتی ہے جو ہم نہیں کر سکتے
کراچی کے بہت بڑے ہوٹل میں ویٹریس ہے۔ اس ہوٹل میں غیر ملکی اور ملکی سیا
شخصیات آکر ٹھہرتی ہیں۔ مایاوتی نوجوان بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ وہ اپنے طر
سے ان لوگوں سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو ہم بھارت ا
امرتسر سنٹر کو پہنچا دیتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ میرے خدایا! دشمن ملک بھارت نے پاکستان میں کیسا خطر
جال پھیلایا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ مایاوتی کیا یہاں کی مقامی ہندو لڑکی ہے؟"

بھگت رام نے کہا۔

"نہیں جناب۔ اس لڑکی کو خاص طور پر راجستھان کے بارڈر سے پاکستان میں سمگ
گیا تھا۔ اس کو یہاں رہتے ہوئے ابھی صرف چھ سات مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"اس دوران مایاوتی نے کیا کارکردگی کی ہے؟"

میں نے اس انداز سے پوچھا جیسے مجھے سچ مچ اوپر سے ان لوگوں کی کارکردگی کا
لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ بھگت رام کہنے لگا۔

"ابھی تک تو سر اس نے ایسی کوئی خفیہ معلومات حاصل نہیں کی جو ہماری
حکومت کے لئے کار آمد ہو۔ لیکن امید ہے کہ آگے چل کر یہ لڑکی مایاوتی بڑ

دکھائے گی۔ اس نے بڑی اہم شخصیات سے رابطہ قائم کر لیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا تم اسے اطلاع کر سکتے ہو کہ آج رات کی اہم میٹنگ میں وہ بھی آجائے؟"

بھگت رام کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"سر! یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ ہمیں صرف ایمرجنسی میں ایک دوسرے سے فون پر بات کرنے کی اجازت ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ایمرجنسی ہے تو میں اسے بھی ٹیلی فون کر کے اطلاع دے دیتا ہوں۔ ورنہ کلینک بند کرنے کے بعد میں خود اس کے پاس ہوٹل جاؤں گا۔"

میں اس بھارتی جاسوس لڑکی مایاوتی کو ہوٹل کے ماحول میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح سے مجھے کسی دوسرے تخریب کار یا مایاوتی کی تخریبی کارروائیوں میں شریک کسی دوسرے مقامی آدمی کا سراغ لگانے کا بھی موقع مل سکتا تھا۔ میں نے بھگت رام سے کہا۔

"تم مت جانا۔ میں خود اس کے پاس جا کر اسے خبر کروں گا۔ میں اس کی بے خبری میں اس کی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا چاہتا ہوں تم مجھے اس کا حلیہ بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کا آج کا پاس ورڈ کیا ہے"

یہ تخریب کار ایک دوسرے کو شکل سے بہت کم جانتے ہیں۔ ایک دو کے صورت شناس ہوتے ہیں۔ اس کے آگے اگر کسی سے ملنا پڑ جائے تو پاس ورڈ سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ ہر روز ایک خاص خفیہ پاس ورڈ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے شہر سے اگر کوئی تخریب کار ملنے آئے تو اسے وہیں سے وہ پاس ورڈ بتا دیا جاتا ہے۔ یہ باتیں بھی مجھے راولپنڈی کے مارگلہ ہوٹل میں بھارتی تخریب کاروں کے چیف کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔

بھگت رام نے الماری کھولی۔ اس میں سے ایک ڈبہ نکالا۔ ڈبے میں سے ایک پرانی ڈائری نکالی۔ اس میں سے ایک لفافہ نکال کر کھولا۔ اور ایک تصویر نکال کر مجھے دی اور کہا۔

"یہ مایاوتی کی تصویر ہے سر!"

یہ ہندو لڑکی راجستھان کی معلوم ہوتی تھی۔ جبڑا چوڑا تھا۔ ہونٹ بھی فراخ تھے۔ ناک اونچا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں کی مانگ درمیان میں سے نکلی ہوئی تھی اور آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ میں نے یہ شکل اپنے ذہن میں بٹھالی اور تصویر بھگت رام کو واپس کر کے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے ڈھونڈھ لوں گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ آج کا پاس ورڈ کیا ہے۔"

بھگت رام بولا۔

"سر! آج کا پاس ورڈ راجہ اشوک کی لاٹھ ہے۔ جب آپ مایاوتی سے کہیں گے کہ کیا تم نے اشوک راجہ کی لاٹھ دیکھی ہے تو وہ کہے گی۔ نہیں۔ آپ کہیں گے کہ کل راجہ رنجیت سنگھ مجھے کراچی کی بندرگاہ پر ملا تھا۔ بس اس کے بعد آپ کو اپنی شناخت کروانے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ مایاوتی سمجھ جائے گی کہ آپ ان کے اپنے گروہ کے آدمی ہیں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے ابھی شہر میں دو ایک ضروری کام کرنے ہیں۔ میں دوپہر کے بعد مایاوتی کے ہوٹل میں جاؤں گا۔ اور ہو سکا تو اسے اپنے ساتھ ہی یہاں لیتا آؤں گا۔"

بھگت رام نے کہا۔

"سر! آپ اندھیرا ہونے کے بعد آئیں۔ مکان کے پیچھے بھی ایک دروازہ ہے۔ کھلا ہوا ہو گا۔ مایاوتی کو معلوم ہے۔"

میں نے کوٹھڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اندھیرا ہوتے ہی مایاوتی کو لے کر یہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم میلا رام کو خبر کر دینا کہ وہ بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جائے۔"

"وہ آجائے گا سر! اس کی فکر نہ کریں۔"

میں اس بھارتی تخریب کار کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اس کی ایک

یہ بھی تھی کہ بہت ممکن تھا کراچی کی انٹیلی جینس ان لوگوں کی نگرانی کر رہی ہو۔ کیونکہ پاکستان کی انٹیلی جینس پولیس کا شمار دنیا کی صف اوّل کے انٹیلی جینس اداروں میں ہوتا ہے۔ میرے میاں جی تو بتایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے زمانے میں جس قتل کا سراغ انگلستان کی سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس لگانے میں ناکام ہو جاتی تھی تو اس قتل کی سراغ رسانی کے لئے پنجاب کی پولیس کو لندن بلایا جاتا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ راولپنڈی میں میری مخبری پر بھارتی تخریب کاروں کا ایک گروہ پکڑا جا چکا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ یہ ڈاکٹر بھی پولیس کی نظروں میں آگیا ہو اور پولیس اس کے ساتھ کہیں مجھے بھی نہ پکڑ لے۔ مجھ پر پہلے ہی لاہور پولیس نے بھارتی جاسوس ہونے کا الزام لگا دیا ہوا تھا۔ جہاں سے میں بھاگ چکا تھا۔

میں بھگت رام عرف اللہ یار ہومیو پیتھ ڈاکٹر کے کلینک سے نکلا تو رکشا پکڑ کر سیدھا کراچی کے اس ہوٹل میں آگیا جہاں بھگت رام بھارتی تخریب کار کے بقول بھارت سے سمگل کی ہوئی نوجوان خوبصورت ہندو لڑکی مایاوتی کسی کرسچین نام سے بطور ہوٹل ویٹرس یا ہوٹل مسٹریس کے کام کر رہی تھی مگر حقیقت میں وہ بھارتی تخریب کاروں کی ساتھی اور انڈین سپائی تھی۔

اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ کوڈ الفاظ اور پاس ورڈ بھی مجھے زبانی یاد تھا۔ میں اس بھارتی لڑکی کو دیکھنا اور اس کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے بھارتی تخریب کاروں بھگت رام اور میلا رام کو بتائے بغیر وہاں کسی تیسرے بھارتی جاسوس سے رابطہ بنا رکھا ہو۔ میں جہاد کشمیر میں دوبارہ حصہ لینے کی خاطر وادی کشمیر میں جانے سے پہلے ان پاکستان دشمن عناصر کا جس قدر ممکن ہو سکتا تھا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا۔

میں کراچی کے عالی شان ہوٹل کا نام نہیں لکھوں گا۔

میری جیب میں پیسے بھی تھے۔ کپڑے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ میں ہوٹل کی لابی میں جا کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کافی منگوالی اور آتے جاتے خوش پوش آدمیوں اور

ملکی اور غیر ملکی عورتوں کو دیکھنے لگا۔ بیرا کچھ دیر کے بعد مجھ سے یہ پوچھنے کے لئے آیا کہ مجھے کچھ اور تو نہیں چاہئے۔ کافی کا بل پندرہ روپے بنتا تھا۔ میں نے دس دس کے تین نوٹ نکال کر نوجوان ویٹر کو دیئے اور اس سے مایاوتی کے بارے میں پوچھا کہ اس وقت اس ڈیوٹی کہاں پر ہو گی۔ نوجوان ویٹر نے میز پر سے کافی کی پیالی اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سر! وہ تیسرے فلور پر ہو گی"

میں نے کہا۔

"میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دو گے؟"

"کیوں نہیں سر!"

میں نے کہا۔

"اس سے کہنا کہ دوبئی سے اس کا کزن جوزف اس سے ملنے کے لئے آیا ہوا ہے اور لابی میں بیٹھا ہے۔"

"او کے سر۔"

ویٹر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ لابی کے بڑے کاؤنٹر پر جا کر اس نے کونے میں رکھا ہوا فون اٹھا کر ڈائیل پر کوئی نمبر گھمایا اور پھر کسی سے بات کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اوپر والی کشادہ سیڑھیوں پر سے ایک سرو قد ایسی گندمی رنگت والی لڑکی کو اترتے دیکھا جس نے ہوٹل کی نیلی اور سفید وردی پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کی مانگ درمیان سے نکلی ہوئی تھی اور ان کا پیچھے جوڑا بندھا تھا۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے لابی کے وسط میں ستونوں کے درمیان لگی ہوئی میزوں کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے چائے کافی پینے میں مشغول تھے۔ وہیں ایک طرف میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں چونکہ ایک جانب بالکل اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور خود بھی اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کو میں پہچان لیا تھا کہ یہی مایاوتی ہے' اس لئے وہ بھی مجھے دیکھتے ہوئے لابی میں آ کر ایک میز پاس رک گئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھی۔ درمیان میں تین چار میزیں لگی تھیں۔

اتنے میں وہی ویٹر جس کو میں نے پندرہ روپے ٹپ دیئے تھے ایک طرف سے تیز تیز چلتا مایاوتی کے پاس آیا اور بڑے شائستہ انداز میں اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ مایاوتی بڑی بے باکی سے میری طرف بڑھی اور آتے ہی انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میرا نام ہی جوزف ہے؟ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"ہاں۔ میں ہی جوزف ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہاں بیٹھ جاؤ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

مایاوتی کی سیاہ آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی مگر چہرے سے وہ بڑی تجربہ کار اور ایسی عورت لگتی تھی کہ جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہو۔ اس کے چہرے پر ذرا سا بھی تبسم نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر تم میرے کزن کہاں سے ہو گئے میرا نام ہی مایاوتی ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے کزن کا بھی باپ ہوں"

اس کا سانولا چہرہ غصے سے دمک اٹھا۔

"کون ہو تم؟ میں ایسی گفتگو سننے کی عادی نہیں ہوں"

تب میں نے کوڈ ورڈ میں کہا۔

"کیا تم نے راجہ اشوک کی لاٹھ دیکھی ہے؟"

تو اس کے غصے کی آگ پر جیسے کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ ایک دم سے اس کا لہجہ نرم اور پراسرار ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے اردگرد کی میزوں کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی۔

"نہیں"

میں نے کہا۔

"کل راجہ رنجیت سنگھ مجھے کراچی کی بندرگاہ پر ملا تھا"

اس پر مایاوتی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی۔

"میرا کمرہ دوسرے فلور کے کونے میں ہے۔ اس کا نمبر 15A ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد وہاں آجانا۔ وہاں باتیں ہوں گی۔"

وہ اٹھی اور لوگوں کو یہ دکھانے کے لئے کہ واقعی میں اس کا کزن ہوں مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملانے کے بعد واپس چلی گئی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اٹھ کر ہوٹل کے اندر بنی ہوئی نوادرات کی دکانوں کی سیر کرنے لگا۔ اس طرح جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو میں لفٹ میں سوار ہو کر ہوٹل کے دوسرے فلور پر آگیا۔ کونے میں 15A نمبر کمرہ بڑی آسانی سے نظر آگیا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے مایاوتی کی آواز آئی۔

"کم ان مسٹر جوزف"

میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

بہت ہی مختلف سا کمرہ تھا جس میں صرف ایک بیڈ لگا تھا اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ مایاوتی پلنگ پر لیٹی انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں ہی گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم پنڈی سے آئے ہو یا امرتسر سے؟"

میں نے کہا۔

"میں امرتسر سنٹر سے پنڈی کرنل چڈھہ کے پاس آیا تھا۔ وہاں سے کراچی بھگت رام اور میلا رام اور تم سے ضروری میٹنگ کرنے آیا ہوں۔ آج رات بھگت رام کے کلینک کے اوپر والے مکان میں ضروری میٹنگ ہے۔ تمہیں وہاں ضرور پہنچنا پہنچنا ہو گا۔"

اسے میری باتوں سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ میں انڈیا کی سنٹرل انٹیلی جنیس ایجنسی کا کوئی بڑا افسر ہوں اور ان لوگوں کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے یہاں آ[یا] ہوں۔ کہنے لگی۔

"سر! کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں تم لوگوں کو آج رات کی میٹنگ میں ہی بتاؤں گا۔ لیکن ایک بات میں تم سے ان لوگوں کو بتائے بغیر کہنا چاہتا ہوں۔ پچھلے دو مہینوں میں تمہاری یہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں جو خفیہ رپورٹیں امرتسر سنٹر سے ہوتی ہوئی دلی کے فیڈرل سیکرٹریٹ سیکرٹریٹ کو پہنچی ہیں وہ بالکل بے کار رپورٹیں ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ مایاوتی کا چہرہ ذرا سا اتر گیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ اسے پاکستان میں رہ کر بھارت کے لئے جاسوسی کرنے کے عوض اچھا خاصا معاوضہ ملتا ہے جو میرے اس ریمارک کی وجہ سے اسے ختم ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ کہنے لگی۔

"سر! میں تو ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ دلی کو بہتر سے بہتر رپورٹ بھجواؤں۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دلی گورنمنٹ کو پاکستان میں آئے ہوئے غیر ملکی وفود کی سرگرمیوں سے اتنی دلچسپی نہیں ہمیں تو یہاں کے سیاسی حالات کی تازہ ترین اور اندرونی رپورٹ چاہئیے۔ آخر تمہیں اتنی تنخواہ کس بات کی دی جا رہی ہے۔"

"مایاوتی تو ایک دم بجھ سی گئی۔ کہنے لگی۔

"سر! آپ جیسی رپورٹیں کہیں گے میں ویسی ہی بھجواؤں گی۔ پلیز مجھے ایک چانس ضرور دیں"

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ خفیہ طور پر کوئی اور آدمی تو کام نہیں کر رہا جس کو اس نے دوسرے بھارتی تخریب کاروں کو بتائے بغیر اپنے ساتھ لگا رکھا ہو۔ کیونکہ ایک عورت اتنی زیادہ جاسوسی نہیں کر سکتی جتنی کارکردگی مجھے بھگت رام نے اس لڑکی کی بتائی تھی۔ میں نے کہا۔

"دلی کی فیڈرل ایجنسی کا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ کسی مرد کو بھی یہاں لگا دیا جائے اور تمہاری تنخواہ میں سے آدھی رقم کاٹ کر اسے دی جائے"

مایاوتی نے میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ کہنے لگی۔

"پلیز! سر! یہ نہ کریں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ سے یہاں کی سیاسی سرگرمیوں کی پوری خفیہ رپورٹ بھیجوں گی۔"

میں نے اس سے براہ راست سوال پوچھ لیا۔

"مایاوتی! مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا تمہارے ساتھ یہاں کا کوئی مقامی یا باہر سے آیا ہوا آدمی تو کام نہیں کر رہا؟"

مایاوتی نے اس کے جواب میں جو وضاحت پیش کی اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے اور وہ اکیلی ہی اس ہوٹل میں بیٹھی پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ جب میری تسلی ہو گئی تو میں نے کہا۔

"او کے۔ رات ہوتے ہی بھگت رام کے کلینک پر پہنچ جانا۔ باقی باتیں وہاں پر ہوں گی۔"

مایاوتی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بڑی ادائے خاص سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"سر! کیا مجھے آپ اپنی خدمت کرنے کا موقع نہیں دیں گے؟"

وہ کیا خدمت کرنا چاہتی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا لیکن اسے معلوم نہیں کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں اور میں حقیقت میں کون ہوں۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور میں اس کے کمرے سے نکل گیا۔

میرے لئے وقت گزارنے کا یہی ایک بہترین ذریعہ تھا کہ کسی سینما ہاؤس میں بیٹھ کر فلم دیکھوں۔ چنانچہ میں صدر کے ایک سینما ہاؤس میں آ گیا۔ یاد نہیں رہا وہاں کون پاکستانی فلم لگی ہوئی تھی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ سارا وقت سینما ہال میں سویا رہا۔ شو ہوا تو ایک آدمی نے مجھے جگا کر کہا کہ شو ختم ہو گیا ہے۔ یہ میٹنی شو تھا۔ شام کے وقت ہوا تھا۔ میں نے ایک ہوٹل میں آ کر چائے پی۔ منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کی اور تازہ دم ہو کر

اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں رکشا پکڑ کر اللہ یار یعنی بھگت رام کے ہومیو پیتھی کے کلینک پر آ گیا۔ میں اس کے کلینک میں ہی بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بھگت رام نے مجھے آنکھوں کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا۔ ٹھیک رات کے آٹھ بجے وہ کلینک بند کرنے کے لئے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"سر! میلا رام اور مایاوتی بھی آنے ہی والے ہوں گے۔ آپ اوپر چل کر بیٹھیں کیا آپ کی ہوٹل میں مایاوتی سے ملاقات ہو گئی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں ہو گئی تھی۔"

میں کلینک سے نکلنے لگا تو اس نے کہا۔

"پیچھے گلی میں مکان کا دروازہ ہے سر! اوپر والا کمرہ کھلا ہی ہے۔"

میں پچھلی گلی کے دروازے میں سے ہو کر مکان کی دوسری منزل والے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ بھی بھگت رام کی دکان کی طرح بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور مایاوتی اندر آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور میں نے اسے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کو کس نے کہا ہے؟ یہاں تم انڈیا کی سپائی ہو۔ تمہیں یہاں کے مسلمانوں کی طرح سلام کرنا چاہیے۔"

وہ آئی ایم سوری سر کہتی ہوئی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بڑے لگاوٹ سے بولی۔

"سر! اگر آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ ہوٹل میں کھائیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ سر! میں آپ کو ایک بڑی خفیہ بات بتانا چاہتی ہوں۔ یہ ایسی راز کی بات ہے کہ بھگت رام اور میلا رام جی کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اس کی دعوت قبول کر لینی چاہئے۔ ہو سکتا ہے پاکستان میں سمگل کئے گئے کچھ اور بھارتی تخریب کاروں کا سراغ مل جائے۔ میں

نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"مایاوتی! میں تمہاری ڈنر کی دعوت قبول کرتا ہوں۔"

وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس نے میرا ہاتھ بے اختیار ہو کر اپنے ہونٹوں سے چوم لیا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ نہ کھینچا۔ میں اس سے خفیہ راز معلوم کرنے کی خاطر اس سے بھرپور تعاون کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"میٹنگ ختم ہو گئی تو میں تمہیں کہوں گا کہ تم اپنے ہوٹل واپس چلی جاؤ۔ تم اسی وقت چلی جانا اور اپنے کمرے میں میرا انتظار کرنا۔ مجھے خواہ رات کے گیارہ بج جائیں مگر میں تمہارے پاس ڈنر کرنے اور تم سے خفیہ راز معلوم کرنے ہر حالت میں پہنچوں گا۔"

مایاوتی نے اپنا چہرہ میرے کندھے کے ساتھ لگایا۔ باہر سے آدمیوں کے سیڑھیاں چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ مایاوتی جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ بھگت رام کے ساتھ میلا رام بھی تھا۔ کمرے کی جلتی بتی کی روشنی میں میں نے میلا رام کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ یہ بھارتی ہندو کسرتی بدن والا بدمعاش ٹائپ آدمی لگتا تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی مگر چہرا بڑا پختہ تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ بھگت رام نے دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"سر! میں نے میلا رام کو بھی بتا دیا ہے کہ امرتسر ہیڈ کوارٹر ہمارے کام سے مطمئن نہیں ہے اور ہمیں اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ کارکردگی دکھانی ہوگی۔ سر! مجھے یقین ہے آپ نے یہ باتیں مایاوتی کو بھی بتا دی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں نے اسے بھی بتا دیا ہے اور اب آپ کو بھی مزید بتانا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی کارکردگی سے دلی فیڈرل حکومت کی انٹیریئر منسٹری اور سنٹرل خفیہ ایجنسی کو سخت مایوسی ہوئی ہے۔"

میں نے ان کے چہروں پر اس بات کا رد عمل دیکھا۔ سب کے چہرے لٹک گئے تھے میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"لیکن دلی گورنمنٹ آپ لوگوں کو ایک چانس ضرور دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ بہرحال آپ ہمارے بااعتماد اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ لیکن مجھے بھارت کی حکومت نے خاص طور پر یہ ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کو دیا جانے والا یہ آخری موقع ہو گا۔ اس میں بھی اگر آپ نے اپنی بہتر کارکردگی نہ دکھائی تو پھر آپ سب کو واپس دلی بلا کر نوکریوں سے برخاست کر دیا جائے گا۔"

تینوں نے باری باری مجھے یقین دلایا کہ وہ اب بہتر سے بہتر کام کریں گے۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! اس جمعے کی نماز کے وقت میں جس مسجد میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کلاشنکوف سے فائر کروں گا بھگوان نے چاہا تو اس فائرنگ سے ایک بھی نمازی مسلمان زندہ نہیں بچے گا۔"

بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ہم کراچی کے سٹی سٹیشن پر اس بار زبردست طاقت والا بم بلاسٹ کریں گے۔ آپ دیکھ لیں گے۔ اتنا زبردست دھماکہ ہو گا اور اتنی تباہی پھیلے گی کہ کراچی والوں نے ایسی تباہی کبھی نہ دیکھی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"شاباش! ایسے دو چار کام کرو گے تو تمہارا ریکارڈ بالکل صاف ہو جائے گا اور میں بھی تمہاری سفارش کر سکوں گا۔"

پھر میں نے بھگت رام سے کہا۔

"تم لوگوں کے پاس اسلحہ بھی ناقص ہوتا ہے اور تمہارے بم بھی ٹھیک وقت پر نہیں پھٹتے۔ ہمیں اس قسم کی رپورٹیں بھی پہنچی ہیں۔ مجھے ابھی چل کر وہ بم اور اسلحہ دکھاؤ جو تم لوگ آئندہ چند دنوں میں استعمال کرنے والے ہو"

بھگت رام بولا۔

"او کے سر! آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم نے تو شہر سے باہر یہ سارا اسلحہ ایک

خفیہ مقام پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ چلیں۔"

میں نے مایاوتی سے کہا۔

"مایاوتی! تم بے شک واپس اپنے ہوٹل چلی جاؤ۔ تم سے کل ملاقات ہو گی۔"

مایاوتی لیس سر کہہ کر اٹھی اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد بھگت رام نے میلارام تخریب کار سے کہا۔

"جاؤ جا کر پرانے گیراج سے اپنی گاڑی نکال کر لے آؤ"

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ہم نے اس قسم کے کاموں کے لئے ایک پرانی گاڑی رکھی ہوئی ہے۔ وارداتیں ہم عام طور پر موٹر سائیکل پر کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمارے پاس دو بالکل نئے موٹر سائیکل موجود ہیں"

پندرہ بیس منٹ کے بعد میلا رام گاڑی لے کر آ گیا۔ ہم مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر اندھیرے میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی ایک طرف روانہ ہو گئی۔ یہ لوگ مجھے اس جگہ پر لے گئے جہاں سارا علاقہ اجاڑ اور ویران تھا۔ اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی خشک پہاڑیاں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے بڑے بڑے ہیبت ناک ڈائنا سورس بیٹھے ہوں۔ ان خشک بنجر ٹیلوں میں ایک جگہ ٹیلے کے پیچھے انہوں نے ایک کچی کوٹھڑی بنائی ہوئی تھی۔ بھگت رام نے کوٹھڑی کا تالا کھولا۔ اندر جا کر اس نے بیٹری سے روشن ہونے والا چھوٹا سا لیمپ جلا دیا۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے دس بارہ بکس پڑے تھے۔ ایک میز پر پندرہ بیس کلاشنکوفیں، دستی بم، پستول، گولیاں اور ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! یہ گرنیڈ بڑے زبردست ہیں۔ اس بار ہم مسجد میں کلاشنکوف کی فائرنگ کے ساتھ چار گرنیڈ بھی ماریں گے۔"

میں نے ایک گرنیڈ اٹھا لیا اور اس کا جیسے معائنہ کرنے لگا۔ پھر ان لوگوں کی

دوسری طرف کرنے کے لئے میں نے لکڑی کے بکسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان بکسوں میں کیا ہے؟"

بھگت رام اور میلارام دونوں بھارتی دہشت گرد لکڑی کے بکسوں کے پاس چلے گئے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرنیڈ جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ان کے پاس جا کر بکسوں کا معائنہ کرنے لگا۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! ان بکسوں میں دھماکہ خیز بارود ہے ہم اس سے خود بھی بم تیار کرتے ہیں۔"

میں نے سخت مزاج انسپکٹر کی اداکاری کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"تم لوگ ناقص بم تیار کرتے ہو۔ مجھے ایک بم تیار کر کے دکھاؤ"

بھگت رام نے جلدی سے ایک بکس کو کھول دیا۔ اس میں بارود کی چھڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی نسواری رنگ کی بڑی سکاچ ٹیپ اور ٹائمر بھی پڑے تھے۔ بھگت رام اور میلارام بارود کی چھڑیوں کو جوڑ کر ٹائم بم تیار کرنے میں لگ گئے۔ میں نے گوشہ چشم سے میز کے کونے کی جانب دیکھا۔ وہاں وہ تالا پڑا تھا جس کو کھولنے کے بعد بھگت رام اندر لے آیا تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔

"میں باہر جا کر اس علاقے کا جائزہ لیتا ہوں کہ یہ جگہ کس حد تک محفوظ ہے اتنی دیر میں تم کم از کم دو ٹائم بم تیار کر کے مجھے دکھاؤ۔ میں اس کام کا ماہر ہوں۔ اگر کوئی کمی رہ گئی تو مجھے فوراً پتہ چل جائے گا۔ اس کے بعد تم دونوں کو واپس بھیج دیا جائے گا۔"

بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ایسا نہیں ہو گا۔ ابھی دس منٹ میں بم تیار کر کے دکھاتا ہوں۔ آپ بے شک اسے چلا کر دیکھ لیں۔ یہاں پندرہ میل تک آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد اندر آ کر دیکھتا ہوں"

دروازے کی طرف جاتے ہوئے میں نے میز کے کونے پر پڑا ہوا تالا بھی اٹھا لیا۔ کوٹھڑی سے باہر آ کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے جیب سے دستی بم نکال کر اس کا پن علیحدہ کر کے اسے وہیں میز پر جہاں دوسرے دستی

بموں کا ڈھیر پڑا تھا رکھ دیا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ مگر یہ اتنی احتیاط سے کیا کہ تالہ لگانے اور کنڈی لگانے کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ دستی بم پھٹنے میں دس پندرہ سیکنڈ کا ہی وقفہ تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر جہاں گاڑی کھڑی تھی وہاں آگیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اسے سٹارٹ کیا اور گاڑی کا گیئر لگا کر اسے جتنی تیز چلا سکتا تھا چلاتا ہوا اس کوٹھڑی سے دور نکل گیا۔ میں دوسرے ٹیلے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ کوٹھڑی میں ایک دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دو یا تین سیکنڈ کے بعد ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ جیسے پہاڑی پھٹ گئی ہو۔ زمین اوپر نیچے ہو گئی۔ میں نے گاڑی کو بالکل نہ روکا۔ پیچھے دیکھا تو جس پہاڑی کے دامن میں اسلحہ اور گولہ بارود والی کوٹھڑی تھی وہاں ایسے آگ لگی ہوئی تھی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ کر آگ اگل رہا ہو۔

دونوں بھارتی تخریب کار اپنے تمام گولہ بارود سمیت اڑ گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو کراچی کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ ہم جس طرف سے گاڑی لے کر آئے تھے میں اسی راستے سے گاڑی واپس لے جا رہا تھا۔ دور سے کراچی کی ستاروں کی طرح جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کراچی شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ کراچی کی سڑکوں پر بڑی رونق تھی۔ گاڑیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ اس کی سڑکوں پر ساری رات ٹریفک جاری رہتی ہے۔ میں نے اس سڑک کو پہچان لیا جو مایاوتی کے عالی شان ہوٹل کی طرف جاتی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد میں ہوٹل پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ سامنے لگے آئینے میں دیکھ کر اپنے بالوں میں کنگھی پھیری اور بڑے آرام اور سکون کے ساتھ گاڑی کی چابی والی زنجیر گھماتا ہوٹل کی لابی میں آکر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مایاوتی کا کمرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اس سے وہ خفیہ راز معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا جس کو بتانے کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ مایاوتی کی مدد سے پاکستان میں بھارتی تخریب کاروں

کے کسی دوسرے گروہ کا پتہ چل جائے گا اور میں مایاوتی کے ساتھ اس گروہ کو بھی جہنم میں پہنچانے کے بعد ہی سری نگر کا رخ کروں گا۔ مایاوتی نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں مجھے خوش کرنے کا سارا بندوبست کیا ہوا تھا۔ کمرے میں صرف بہت دھیمی روشنی والا ٹیبل لیمپ ہی پلنگ کے سرہانے کی جانب روشن تھا۔ فضا میں کسی غیر ملکی پرفیوم کی بڑی رومانوی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ مایاوتی نے گلابی رنگ کا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا جس میں سے اس کے جسم کے خطوط نمایاں تھے۔ میرے لئے یہ خطوط بے معنی ہو چکے تھے۔ اس لئے کہ میں ان خطوط کی اصل حقیقت کو جان چکا تھا کہ یہ وہ پتھر ہیں جو منزل کی طرف جانے والے راستے میں محض اس لئے پڑے ہوتے ہیں کہ مسافر کو اس کی منزل تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ مایاوتی نے پلنگ سے اٹھ کر میرا خیر مقدم کیا اور دروازہ بند کر کے پلنگ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے تخریب کاروں کے اسلحہ بارود کے بارے میں پوچھا جس کا میں معائنہ کرنے گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے مگر ان لوگوں کو ٹائم بم بنانے نہیں آتے۔ اسی لئے وہ دھماکے کے بعد زیادہ نقصان نہیں کرتے۔"

مایاوتی کہنے لگی۔

"سر! آپ کو چاہیے کہ امرتسر سے کوئی اس کام کا ماہر بلا لیں۔ بھگت رام اور بیلارام کو ایمونیشن کی اتنی سمجھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ رپورٹ بھی میں امرتسر جا کر پیش کرنے والا ہوں۔ وہاں جو فیصلہ ہو گا اس پر فوراً عمل کیا جائے گا۔"

میں نے مایاوتی سے براہ راست سوال کر دیا۔

"تم مجھے کوئی راز بتانے والی تھیں۔ وہ کون سا راز ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ یہ راز تم نے مجھے بتایا تھا"

مایاوتی اٹھ کر دیوار میں لگی ہوئی الماری کے پاس گئی۔ اس میں سے دو گلاس اور

بوتل نکال کر اس نے میز پر رکھ دی اور انگریزی میں بولی۔

"سر! پہلے تو آپ فریش ہو جائیں پھر راز کی بات بتاؤں گی"

میں نے کہا۔

"مایاوتی! میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور جب میں ڈیوٹی پر ہوتا ہوں تو شراب وغیرہ بالکل نہیں پیتا۔"

میں نے مایاوتی کے گلاس میں شراب کا ایک پیگ بنا دیا۔

"ہاں تم بے شک پی سکتی ہو۔ کیونکہ تم ڈیوٹی پر نہیں ہو۔"

مایاوتی مجھ سے لاڈ پیار کے موڈ میں تھی۔ میں نے اپنے رویے سے اس پر واضح کر دیا کہ میں اس موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اس سے کہا۔

"تم بے فکر ہو کر مجھے راز بتا دو۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔"

مایاوتی نے شراب کے دو تین گھونٹ پیئے اور سگریٹ سلگانے کے بعد بولی۔

"سر! آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ اس علاقے میں ہمارے بھارت ورش کا ایک سندھی ہندو مرچنڈانی بھی موجود ہے جس کو دلی کی حکومت نے بڑے وسیع اختیارات دے رکھے ہیں۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ سگریٹ کا کش لگا رہی تھی۔ اس نے دھواں چھوڑ ہوئے کہا۔

"سر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے بے ہوتے ہیں مرچنڈانی کے بارے میں بھگت رام اور میلارام کو بھی علم نہیں کہ وہ ہما بھارت ورش کا کتنا بڑا سپائی اس علاقے میں کام کر رہا ہے۔ پہلے مجھے بھی معلوم نہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ میں ہوٹل میڈیا میں ہوں۔ یہاں ہر قسم کے لوگوں سے وا ہے۔ ایک بار کراچی کے ایک بازار میں دو تخریب کاروں نے اندھا دھند فائرنگ دس پندرہ آدمیوں کو مار ڈالا۔ میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو خوش ہوئی کہ ہمار

پاکستان میں دہشت گردی کا کام بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ لیکن اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ ایک دہشت گرد موقع پر پکڑا گیا تھا مگر دوسرے دہشت گرد نے موٹر سائیکل پر سے اس پر کلاشنکوف کا برسٹ مار کر اسے بھی ہلاک کر ڈالا اور بھاگ گیا۔"

مایاوتی نے یہ کہہ کر گلاس میں سے ایک دو گھونٹ پیئے اور خاموشی سے سگریٹ کے کش لگانے لگی۔ میں نے کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ اس میں راز کی کون سی بات ہے؟"

مایاوتی میرے قریب ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"سر! مجھے کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہ واردات بھگت رام اور میلارام کی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مرچنڈانی نام کا ایک بھارتی دہشت گرد ہے جو کراچی کی مچھلی مارکیٹ سے کچھ فاصلے پر بظاہر کمشن ایجنٹ کا کام کرتا ہے اور اس کے پاس دو موٹر لانچیں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک لانچ میں وہ اسلحہ وغیرہ چھپائے رکھتا ہے کسی کو اس پر اس لئے شک نہیں پڑتا کہ وہ علاقے میں غریبوں اور بیواؤں اور یتیم بچوں کی مدد کرتا رہتا ہے اور اس نے ان کے وظیفے لگا رکھے ہیں۔"

"لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ مجھ سے اصل بات بیان کرو"

مایاوتی نے کہا۔

"سر! میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں اور صرف آپ ہی سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ مرچنڈانی ہماری کاز کو نقصان پہنچا رہا ہے"

"وہ کیسے؟"

مایاوتی ہلکے ہلکے سرور میں تھی۔ کہنے لگی۔

"سر! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں پاکستان میں بم دھماکوں اور مختلف جگہوں پر فائرنگ کرنے کی اگرواد کی وارداتوں کے لئے بعض اوقات مقامی لوگوں کو ہائر کرنا پڑتا ہے۔ ہم انہیں الگ الگ واردات کے عوض بھاری رقم ادا کرتے ہیں اور یہ رقم ہماری ٹا کی حکومت کے خزانے سے ادا کی جاتی ہے۔"

میں نے اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”ان مقامی لوگوں میں یہاں کے مسلمان بھی ضرور ہوتے ہوں گے۔“

مایاوتی نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

”نو سر۔ کوئی مسلمان خواہ وہ اپنی حکومت کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون بہانے پر کبھی تیار نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کوئی مسلمان کسی مسجد میں بم گرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا“

”تو پھر تم لوگ ایسے آدمی کہاں سے لاتے ہو؟“

مایاوتی کہنے لگی۔

”سر! یہاں سندھ میں ہمارے ہندو بھائی بہت رہتے ہیں۔ ان میں سے ہمیں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو معقول معاوضہ لے کر ایسی وارداتیں کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ سر! اصل راز کی بات میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مرچنڈانی اس کام کے لئے بہت کم روپے دے کر اناڑی ہندو نوجوانوں کو ہائر کرلیتا ہے۔ وہ دلی حکومت سے ایک واردات کے دس ہزار روپے وصول کرتا ہے مگر واردات کرنے والے کو صرف دو ہزار روپے دیتا ہے چونکہ وہ آدمی اناڑی ہوتا ہے اس لئے راضی ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکثر وارداتیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ جہاں فائرنگ کرنے اور بم کے دھماکے سے سو آدمیوں نے ہلاک ہونا ہوتا ہے ہاں صرف دس پانچ آدمی ہی ہلاک ہوتے ہیں۔“

مایاوتی نے بھارتی دہشت گردوں کے ماسٹر سپائی مرچنڈانی کے خلاف کافی زہر اگلا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ مایاوتی کو ہندو ماسٹر سپائی مرچنڈانی سے کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ مگر مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ ایک اور بھارتی دہشت گرد کا سراغ مل گیا تھا۔ اور یہ دہشت گرد بڑا اہم اور ماسٹر سپائی تھا۔ اس کو ختم کرنا بھی بہت ضروری تھا۔

میں نے مایاوتی سے کہا۔

”میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ مجھے مرچنڈانی کا پورا پتہ بتاؤ۔ میں سب

پہلے خود وہاں جا کر اس پر اپنا آپ ظاہر کئے بغیر اس کا سروے کرنا چاہتا ہوں مجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کے بعد میں اس کی فل رپورٹ بنا کر دلی سیکرٹریٹ کو روانہ کردوں گا اور یقین کرو کہ اسے فوراً واپس انڈیا بلالیا جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔“

مایاوتی بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

”لیکن سر! پلیز اس ساری کارروائی میں میرا کہیں نام نہیں آنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”تم مرچنڈانی سے ڈرتی کیوں ہو؟ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ دلی آفس تمہاری کارکردگی پر خوش ہوگا کہ تم نے ایک نااہل شخص کی نااہلیت کو بے نقاب کیا۔“

مایاوتی بولی۔

”پھر بھی سر! پلیز میرا نام ظاہر نہ کریں۔ مجھے مرچنڈانی سے سچ مچ ڈر لگتا ہے۔ اس نے بڑے بدمعاش پال رکھے ہیں۔“

مجھے مایاوتی کی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اس سے مرچنڈانی کے گھر کا پورا پتہ حاصل کرلیا اور جب اٹھ کر جانے لگا تو مایاوتی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

”سر! آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ میں نے آپ کے لئے ماش کی دال خاص طور پر بنوائی ہوئی ہے۔ آپ پلیز یہاں بیٹھیں میں کھانا منگواتی ہوں۔ ابھی ایک سیکنڈ میں۔ پلیز!“

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس عورت نے مجھے بھی ہندو سمجھتے ہوئے مرغ مسلم کی جگہ دال کا بندوبست کر رکھا تھا۔ بہرحال میں بیٹھ گیا۔ مایاوتی نے پلنگ سے اترنے کے بعد ریشمی گاؤن کی ڈوری کمر پر باندھی۔ ایک شال کندھوں پر اوڑھی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کے کمرے کے باہر ہی راہ داری میں ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کے فون پر بات کرنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کسی سے فون پر کہا کہ کھانا جلدی لے آئے۔ وہ کمرے میں واپس آئی تو اس کے قدم ذرا سے ڈگمگائے۔ میں نے

سے سہارا دیا تو وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"مایاوتی! تمہیں شراب زیادہ نہیں پینی چاہیے۔"

وہ اس نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر دیکھا اور عاجزی سے کہا۔

"سر! بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں روز نہیں پیتی۔ کبھی کبھی رات کو تھکان دور کرنے کے لئے پی لیتی ہوں اور وہ بھی ایک ڈبل پیگ سے زیادہ نہیں پیتی۔ لیکن آج آپ کے آنے کی خوشی میں تین پیگ پی گئی ہوں۔ سر! مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری رپورٹ میں یہ نہ لکھئے گا کہ میں رات کو شراب پیتی ہوں۔"

میں نے اس کو تسلی دی کہ میں اس کی شراب کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا اور اس کی بڑی اچھی رپورٹ دلی سیکریٹریٹ کو بھجواؤں گا۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس مایاوتی کا کیا کروں۔ مرچنڈانی کو ختم کرنے سے پہلے مایاوتی کو بھی ختم کرنا تھا۔ آخر یہ بھی پاکستان کی نہ صرف دشمن تھی بلکہ پاکستان کی سلامتی کے خلاف تخریب کاریوں میں مصروف تھی۔ اس کی ان کارروائیوں سے اب تک نہ جانے پاکستان کو کس قدر نقصان پہنچ چکا تھا اور نہ جانے کراچی کے کتنے بے گناہ لوگ شہید ہو چکے تھے۔ پاکستان کی سرزمین کو مایاوتی اور مرچنڈانی ایسے لوگوں کے وجود سے ہمیشہ کے لئے پاک کرنا بے حد ضروری اور قومی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ مایاوتی کو میں اس وقت بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ لیکن میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے میں کچھ جھجک رہا تھا۔ حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ میں اسے خود ہلاک کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پولیس کو اطلاع کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اس سے پوچھ گچھ کے دوران ہو سکتا ہے پولیس کو کچھ مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔ اور پولیس کی حراست سے اس لڑکی کا فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ اس میں ایک بات کا خطرہ ضرور تھا کہ مایاوتی کے ساتھ پولیس کے تشدد کی کارروائی کے پہلے مرحلے میں ہی وہ پولیس کو بھگت رام اور میلارام کے علاوہ میرا پورا حلیہ بھی بتا دیتی باقی دونوں بھارتی

تخریب کاروں کو تو پولیس تلاش نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان کے جسموں کے ٹکڑے اڑ چکے تھے لیکن پولیس کو میرا حلیہ ضرور معلوم ہو جاتا اور پہلے لاہور کی پولیس میرے پیچھے تھی اور اب کراچی سندھ کی پولیس بھی میرے پیچھے پڑ جاتی۔ اس کا میں نے ایک ہی حل سوچا کہ پہلے پاکستان دشمن مرچنڈانی کا قصہ پاک کیا جائے اس کے بعد مایاوتی کو گرفتار کروا دیا جائے۔ تاکہ اگر وہ پولیس کو میرا حلیہ بتا بھی دیتی ہے تو جب تک کراچی کی پولیس مجھے تلاش کرنے نکلتی میں وہاں سے بہت دور سری نگر کی پہاڑیوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

وہ رات میں نے کھانا کھانے کے بعد مایاوتی کے کمرے میں نہیں بلکہ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں بسر کی اور صبح مرچنڈانی سے دو دو ہاتھ کرنے ساحل سمندر کی اس بستی کی طرف نکل کھڑا ہوا جہاں پاکستان دشمن بھارتی دہشت گرد مرچنڈانی رہتا تھا۔ مایاوتی سے میں نے اس کا پورا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ لیکن سب سے ضروری بات جو میں مایاوتی سے معلوم کرنا نہیں بھولا تھا وہ اس روز کا پاس ورڈ تھا۔ مایاوتی نے ایک خفیہ کاپی میں سے مجھے اس روز کا پاس ورڈ پڑھ کر بتا دیا۔ وہاں پورے پندرہ دنوں کے الگ الگ پاس ورڈ لکھے تھے جو ان تخریب کاروں کے باہمی مشورے سے طے ہوئے تھے میں نے مایاوتی سے کہا۔

"میں شام تک واپس آجاؤں گا اور مرچنڈانی کے کام کا پورا جائزہ لے کر آؤں گا۔ تاکہ اس کے بارے میں تمہاری خفیہ رپورٹوں کی روشنی میں امرتسر سنٹر اور دلی کی حکومت کو بریف کر سکوں"

مایاوتی کی واقعی مرچنڈانی سے کوئی ذاتی دشمنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے میں اس کے دشمن کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ ہوٹل سے نکلتے ہی میں نے ایک بس پکڑی جس نے پون گھنٹے کی مسافت کے بعد کراچی شہر سے دور ساحل سمندر کے ایک بس سٹاپ پر پہنچا دیا۔ مایاوتی نے اس بس سٹاپ کی جو نشانیاں بتائی تھیں وہ یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف سمندر کی کھاڑی تھی اور دوسری طرف مچھواروں کی جھونپڑیاں دور تک چلی گئی تھیں آگے جا کر بستی کے مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ سمندر میں ماہی گیروں کی کشتیاں تیرتی پھرتی تھیں۔

ماہی گیروں کی بستی میں ایک چھوٹی سی مچھلی مارکیٹ تھی۔

صبح کے وقت یہاں کافی رونق تھی۔ مچھلیوں کے ڈھیر اور بڑے بڑے ٹوکروں کی نیلامی بولی جا رہی تھی۔ بہت شور مچا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے مرچنڈانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ مرچنڈانی کے آدمی مارکیٹ میں موجود ہیں وہ خود اس وقت گھر پر ہی ہو گا۔ اس کا مکان وہاں سے تھوڑے فاصلے پر کھاڑی سے ذرا ہٹ کر ناریل کے درختوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اونچی چار دیواری تھی۔ لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ چار دیواری کے اندر اک منزلہ مکان تھا جس کی لوہے کی گیلری پر ایک سندھی اجرک سکھانے کے لئے ڈال رکھی تھی۔ گیٹ کی ایک جانب تین گدھا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گاڑیاں خالی تھیں۔ گاڑیوں کے پاس ہی درخت کے نیچے دو آدمی چائے کی چینک درمیان میں رکھے گلاسوں میں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ لباس اور شکل صورت سے وہ مزدور یا مچھوارے لگتے تھے۔ میں ان کے قریب گیا تو وہ باتیں کرتے رک گئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے مرچنڈانی کے بارے میں پوچھا تو ایک نے لوہے والے گیٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"یہ سیٹھ کا گھر ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"سیٹھ مرچنڈانی گھر پر ہے یا کہیں گیا ہوا ہے۔"

دوسرے آدمی نے کہا۔

"بابا گھنٹی بجا کر معلوم کر لو۔ سیٹھ اس وقت گھر پر ہی ہوتا ہے۔"

میں نے گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر گھنٹی والا بٹن دبایا۔ تین چار بار بٹن دبانے سے اندر کسی کی آواز سنائی دی

"اری دیکھ کون ہے باہر"

لوہے کا گیٹ بڑا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ چھوٹا دروازہ کھلا تو ایک نوکرانی نے مجھ سے پوچھا

"کیا بات ہے جی۔ کس سے ملو گے؟"

میں نے سیٹھ مرچنڈانی کا نام لیا تو وہ دروازہ بند کرتے ہوئے یہ کہہ کر چلی گئی کہ پتہ کرتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی۔ کہنے لگی۔

"کیا کام ہے سیٹھ جی سے؟"

میں نے کہا۔

"میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ ان کو ایک ضروری پیغام دینا ہے۔"

نوکرانی ایک بار پھر دروازہ بند کر کے اور مجھے رکنے کا کہہ کر چلی گئی۔ اس بار ایک سیاہ گھنگریالے بالوں والے مکرانی نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنی انگارہ ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کیوں جی۔ کس سے ملو گے؟"

میں نے کہا۔

"بابا مجھے سیٹھ مرچنڈانی سے ملنا ہے۔ اس سے کہو کہ میں راولپنڈی سے اس ایک دوست کا خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے بابا؟"

میں نے کہا۔

"میرا نام بلاول ہے۔"

"ابھی ٹھہرو یہاں"

وہ بھی چلا گیا۔ اس مرچنڈانی نے اپنی سیکورٹی کا معلوم ہوتا ہے بڑا سخت انتظام کر رکھا تھا۔ اور کوئی اجنبی شخص کافی چھان پھٹک کے بعد اس سے مل سکتا تھا۔ مکرانی واپس آکر مجھے اپنے ساتھ مکان کے اندر لے گیا۔ سارے مکان میں مچھلیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف کچھ عورتیں بیٹھیں مچھلیوں کے ٹوکرے دھو رہی تھیں۔ مکان کے برآمدے میں آکر مکرانی مجھ سے اجازت لئے بغیر میرے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مکرانی بولا۔

"تلاشی لے رہا ہوں بابا اور کیا کر رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہیں تمہارے پاس اسلحہ وغیرہ تو نہیں ہے۔ ہمارے سیٹھ جی کے یہاں سجن بھی ہیں تو دشمن بھی بہت ہیں۔ آجاؤ"

اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ جس کی دیوار پر قائد اعظم کی تصویر والا کیلنڈر بھی لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی رام لچھمن کی تصویر بھی لگی تھی۔

"تم بیٹھو۔ سیٹھ صاحب ابھی آکر تم سے ملتے ہیں۔"

وہ چلا گیا۔ میں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے پٹ کھلے تھے۔ اور سلاخوں میں سے کھاڑی کی جانب سے سمندر کی مرطوب ہوا اندر آرہی تھی۔ میں پاس ورڈ کے وہ فقرے ذہن میں دہرانے لگا جو مایاوتی نے مجھے اپنی ڈائری میں سے پڑھ کر بتائے تھے اور جو ان تخریب کاروں کا اس روز کا خفیہ پاس ورڈ تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک ناٹے قد کا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے چار خانے والا تہہ باندھا ہوا تھا۔ ایک صدری جسم پر تھی۔ کاندھے پر حاجیوں والا رومال تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ سر منڈا ہوا تھا۔ توند تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ ماتھے پر ہندوؤں والا تلک اس نے نہیں لگایا تھا۔ وہ ہندو تھا اور ہندو کے اصلی روپ میں ہی وہاں کاروبار کرتا تھا مگر اس نے اپنا حلیہ مسلمانوں والا بنایا ہوا تھا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"کہاں سے آئے ہو جی؟ کس کا پیغام لائے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مرچنڈانی آپ ہی کا شبھ نام ہے؟"

کہنے لگا۔

"ہاں جی۔ میں ہی سیٹھ مرچنڈانی ہوں۔ فرمایئے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟ آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں بھی ہندو ہوں۔ میں نے کہا۔

"میرا نام موہن چندر ہے۔ میں راولپنڈی سے آیا ہوں۔"

وہ میرے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"جی مہاراج! کس نے بھیجا ہے آپ کو؟"

تب میں نے اس روز کے خفیہ پاس ورڈ میں کہا۔

"یہ بتائیں کہ کیا گاندھی نہرو ملاقات آج ہی ہونے والی ہے؟"

یہ جملہ سننے کے ساتھ ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اٹھ کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور بولا۔

"آپ شیواجی مرہٹہ کے بڑے بھائی ہیں؟"

میں نے خفیہ کوڈ کا آخری جملہ دہرا دیا۔

"بڑے بھائی کا دیہانت ہو گیا ہے"

یہ تین مکالمے ان تخریب کاروں کے اس روز کے پاس ورڈ یا خفیہ کوڈ کے جملے تھے۔ ان جملوں سے انہیں اس روز ایک دوسرے کی شناخت کرنی تھی۔ مرچنڈانی نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے امرتسر سنٹر کی طرف سے پاکستان میں آپ لوگوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ہمیں ایسی رپورٹیں ملی ہیں کہ یہاں کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا۔

اور آپ لوگ انڈین گورنمنٹ کا پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔"
پھر میں نے اسے کرنل چڈھہ بھگت رام میلارام اور مایاوتی کے ضمن میں ساری
تفصیلات سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ کراچی میں تخریب کاری کا کام انتہائی غیر تسلی بخش
ہے اور انڈیا کی سنٹرل سیکرٹ ایجنسی آپ لوگوں کو چھٹی دینے کے بارے میں سوچ رہی
ہے۔ سیٹھ مرچنڈانی کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"سر! ہم تو بڑی ذمے داری سے کام کر رہے ہیں۔ پچھلے ماہ ہم نے حیدر آباد میں بھی
فائرنگ کروا دی تھی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس سب رپورٹیں موجود ہیں اور
میں یہ رپورٹیں پڑھ کر دلی سے چلا تھا۔"

وہ میری خاطر تواضع میں لگ گیا اور میری خوشامدیں شروع کر دیں۔ میں یہ معلوم
کرنا چاہتا تھا کہ یہاں اس کے دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور اس نے اسلحہ وغیرہ جمع
لانچ میں چھپا رکھا ہے وہ کہاں پر ہے۔ میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے اسلحہ کو بھی چیک کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی رپورٹیں ملی ہیں کہ تم
بچاتے ہو اور گھٹیا اسلحہ خرید لیتے ہو جو عین وقت پر دھوکا دے جاتا ہے۔"

مرچنڈانی نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولا۔

"سر! یہ بالکل غلط ہے۔ ہم اعلیٰ کوالٹی کا اسلحہ خریدتے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہاں تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان میں یہاں کے
کتنے ہیں اور ہندو کتنے ہیں۔"

یہ میں نے بلف چال چلی تھی۔ وہ بولا۔

"سر! مسلمان تو نہیں ہیں۔ دو ہندو ضرور ہیں۔ وہی کراچی حیدر آباد اور
میں وارداتیں کرتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"ان لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر بلاؤ۔ میں دوپہر کا کھانا تمہاری لانچ میں ان لوگوں
کے ساتھ ہی کھاؤں گا اور وہیں تمہیں وہ حکم سناؤں گا جو تمہارے بارے میں دلی آفس
نے مجھے دے کر یہاں بھیجا ہے۔"

مرچنڈانی کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ کہنے لگا۔

"سر! ہم سے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اسے شما کروا دیجئے۔ آئندہ سے سارا کام
بالکل ٹھیک ہو گا۔"

مایاوتی نے اس شخص کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا کہ یہ انڈیا حکومت کے پیسے
کھاتا ہے اور ناقص اسلحہ خریدتا ہے میں اسے اب تسلی بھی دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس
کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مرچنڈانی! تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے تم اپنی خاص لانچ
پر ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرو اور دونوں اپنے ہندو بھائیوں کو بھی وہاں پہنچنے کی
خبر کر دو۔ وہاں تم سے بات ہو گی۔"

"آپ یہ مٹھائی کھائیں سر! میں ابھی ان دونوں کو خبر کر دیتا ہوں"

اس دوران وہی مکرانی نوکر کمرے میں مٹھائی کی تھالی رکھ گیا تھا۔ مرچنڈانی چلا گیا تو
میں نے جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ مجھے ان لوگوں کو ہلاک
کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت میرے سامنے ایک ہی طریقہ تھا کہ ان لوگوں کو
اس لانچ میں جمع کروں جس کے نیچے اسلحہ کا ذخیرہ رکھا ہوتا ہے اور پھر کسی طریقے سے
اس کو دھماکے سے اڑا دوں۔

مرچنڈانی کے پاس تخریب کاروں کو اطلاع دینے کے لئے ضرور وائرلیس وغیرہ تھا یا
فون پر وہ خفیہ الفاظ میں انہیں اطلاع دیتا تھا۔ واپس آ کر مجھے کہنے لگا۔

"سر! میں نے اپنے دونوں آدمیوں کو اطلاع کر دی ہے وہ دوپہر کے وقت لانچ پر
آجائیں گے۔"

میں نے یہاں بھی وہی ترکیب استعمال کی جو پہلے دو تخریب کاروں کے ساتھ استعمال کی تھی۔ میں نے مرچنڈانی سے کہا۔

"تم میرے ساتھ لانچ پر چلو۔ میں تم لوگوں کا اسلحہ وغیرہ چیک کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور سر ضرور۔ ابھی چلے چلتے ہیں میں گاڑی منگوالوں۔"

اس نے ایک کھٹارا قسم کی جیپ رکھی ہوئی تھی جس کی سیٹیں اکھڑ چکی تھیں اور چھت غائب تھی۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر سمندری کھاڑی کے دوسرے کنارے کی طرف پہنچے تو وہاں کنارے پر ایک گھاٹ بنا ہوا جس کے ساتھ لگ کر ایک پرانی لانچ پانی کی لہروں پر اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ کچھ مزدور اس میں سے مچھلیوں کے ٹوکرے اتار رہے تھے مرچنڈانی کو دیکھ کر انہوں نے اسے سلام کی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے مرچنڈانی سے پوچھا۔

"کیا یہی لانچ ہے؟"

وہ بولا۔

"نہیں سر۔ وہ لانچ دوسری ہے اس طرف کھڑی ہے"

اس نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں کھاڑی کا سمندر اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ یہاں تک ہم ایک کشتی میں سوار ہو کر گئے۔ ان درختوں کے پیچھے ایک دوسری لانچ کھڑی تھی۔ اس لانچ پر رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ پہلے والی لانچ سے یہ ذرا بڑی تھی۔ کشتی لانچ کے ساتھ لگ گئی۔ مرچنڈانی کے کچھ ملازم وہاں پر موجود تھے۔ چھوٹے سے ڈیک پر دو ماہی گیر بیٹھے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ وہ مجھے لانچ کے نیچے لے گیا یہاں ہم ایک تنگ راہ داری میں سے گزر کر ایک کیبن کے دروازے پر آ گئے۔

دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔

مرچنڈانی نے صدری کی جیب سے چابی نکالتے ہوئے کہا۔

"سر! ہم اس کیبن میں اپنا اسلحہ وغیرہ اور دوسری چیزیں رکھتے ہیں۔"

میں نے مصنوعی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہاں تو چھاپہ پڑنے کا ڈر ہے۔ تم کسی دوسری جگہ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

وہ تالا کھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! ویسے تو ہم نے اس کی حفاظت کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ لیکن اگر آپ کا حکم ہے تو میں اسے کسی دوسری جگہ چھپا دوں گا۔"

کیبن میں کافی اسلحہ تھا۔ کلاشنکوفیں' رائفلیں' دستی بم' چار پانچ ریوالور اور ٹائم بم کی سٹکیں بھی تھیں۔ چھ سات ٹائم بم مکمل تیاری کی حالت میں تھے۔ کونے میں ایک طرف لکڑی کا بکس پڑا تھا۔ معلوم ہوا اس میں ڈائنا مائیٹ کی سٹکیں ہیں۔ ان سٹکوں کو جوڑ کر ٹائم بم بنایا جاتا تھا جس کے ساتھ ٹائمر کی ڈیوائیس لگا دی جاتی تھی۔ میں بڑے غور سے اسلحہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس لانچ کو کس طرح دھماکے سے اڑایا جائے۔ دھماکے سے پہلے میں خود وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس وقت تک کوئی منصوبہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ہم لانچ کے اوپر ڈیک پر آ کر آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مرچنڈانی نے جال مرمت کرتے مزدوروں کو نیچے بھیج دیا۔ میں اس کے ساتھ امرتسر انٹیلی جینس سنٹر اور دلی سیکریٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر کی باتیں کر کے اس پر مزید اثر ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پاس ورڈ کے خفیہ مکالمے نے مرچنڈانی کو یقین دلا دیا تھا کہ میں امرتسر سنٹر کا خاص آدمی ہوں جسے وہاں ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ بولا۔

"سر! میرے پاس بڑی اعلیٰ قسم کی سکاچ موجود ہے۔ اگر حکم کریں تو میں لے آؤں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈیوٹی پر نہیں پیا کرتا۔"

وہ خاموش ہو گیا اس نے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں کہ جن ہندوؤں کو ہم پیسے دے کر دھماکے وغیرہ کرواتے ہیں وہ اب زیادہ پیسے مانگنے لگے ہیں۔

"ہیڈ کوارٹر سے کہیے کہ ہمارے فنڈ کی رقم بڑھا دی جائے۔ اس رقم سے گزارہ نہیں ہوتا اور کام بھی تسلی بخش طریقے سے نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔

"میں اس سلسلے میں دلی جا کر خود سیکرٹ سروس کے انچارج سے بات کروں گا۔

تم ابھی انہی سے گزارہ کرو"

کھانے کا انتظام اسی لانچ میں کیا گیا تھا۔ دوپہر ایک بجے دونوں ہندو تخریب کا
آ گئے۔ دونوں پکی عمر کے تھے۔ آتے ہی انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور
ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ دونوں مرچنڈانی کے خاص تخریب کار آد

میں نے اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھا۔

"اگر اپنے گروہ کے اور آدمی بھی ہوں تو انہیں بھی فوراً بلوا لو۔ ان س
کوارٹر کی ضروری ہدایات پہنچانا ضروری ہے۔"

مرچنڈانی بولا۔

"نہیں سر اور کوئی نہیں ہے۔ ابھی تک تو یہی دو آدمی ٹھیک ٹھاک کام کر
حیدر آباد کے بازار میں انہوں نے ہی فائرنگ کی تھی اور کراچی میں بھی تین جا
کر چکے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ فکر نہ کرو بدبختو! تم سے ایک ایک پاکستانی کے خون کا
حساب لوں گا۔ میں نے اس کے بعد یونہی ان کو ہدایات دینی شروع کر دیں
کرتے ہوئے کہ یہ خاص ہدایات مجھے براہ راست دلی سیکرٹ سروس کے ہیڈ
موصول ہوئی ہیں۔ یہ میٹنگ کوئی آدھے گھنٹے تک جاری۔

اس اثناء میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے ان لوگوں کو لانچ کے گولہ بارو
ہی کیسے اڑانا ہے۔ کھانا شروع ہو گیا۔ کھانے کے بعد میں نے مرچنڈانی اور دو
دشمن ہندو تخریب کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات تم تینوں اسی لانچ میں میرے ساتھ رہو گے۔ میرا ا
وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ہو سکتا ہے رات بارہ بجے کے مجھے امرتسر سے کوئی

مرچنڈانی نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے سر! ہم لوگ اسی لانچ پر سو جائیں گے۔ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ
یں آپ کے لائق سونے کا انتظام شاید نہ ہو"

یں نے کہا۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اور جب ہم بھارت ماتا کے لئے ڈیوٹی دے رہے ہوتے ہیں تو
م کے کشٹ اٹھانے کو تیار رہتے ہیں۔"

مرچنڈانی اور دوسرے دونوں ہندو تخریب کار میری اس بات پر بڑے خوش ہوئے۔
ا سارا دن میں نے لانچ پر ان لوگوں کے درمیان ہی گزارا۔ میں نے انہیں ایک لمحے
لئے بھی ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔ شام کو میں نے خاص طور پر ان لوگوں کو اپنے پاس بلا
ٹھے چائے پی اور رات کا کھانا بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا
ں نے مرچنڈانی سے کہا۔

"تم لوگ کہاں سوؤ گے؟"

وہ بولا۔

"سر! ہم نیچے کیبن میں سوئیں گے۔ اوپر کھلے میں مچھر بہت ہوتے ہیں۔ آپ کا بستر
نے ساتھ والے کیبن میں لگا دیا ہے۔ آیئے آپ کو دکھا دوں"

تینوں میرے ساتھ نیچے آ گئے۔ لانچ میں عرشے کے نیچے لمبے دو کیبن تھے۔ ایک
یں مرچنڈانی نے اپنے اور اپنے دونوں آدمیوں کے لئے برتھ پر بستر بچھا دیئے
تھے۔ جالی دار پنکھا گھوم رہا تھا۔ ساتھ والے کیبن میں میرا بستر لگا تھا۔ یہاں بھی
ے ساتھ گھومنے والا جالی دار پنکھا چل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

اب تم لوگ جا کر سو جاؤ۔ مجھے بارہ بجے تک جاگنا ہو گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے امرتسر
رلیس پر کوئی پیغام آ جائے۔"

انے اپنی پتلون کی پچھلی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چھوٹا وائرلیس ٹرانسمیٹر میری جیب میں موجود ہے۔ اگر کوئی خاص ہدایت موصول

ہوئی تو میں تم لوگوں کو صبح بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر"

تینوں تخریب کار مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد ساتھ والے کیبن میں چلے گئے۔ میں اپنے کیبن کے برتھ پر لیٹ گیا۔ میرا اصل کام اب شروع ہونے والا تھا۔ سب سے پہلے مجھے ان لوگوں کے سو جانے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے بعد اسلحہ والے کیبن کا تالا کسی طریقے سے کھولنا تھا۔ میں نے اس خیال سے مرچنڈانی سے اسلحہ والے کیبن کی چابی نہیں لی تھی کہ میرے پاس چابی لینے کا کوئی معقول جواز نہیں تھا اور تالا کھولنے میں میں بڑا ماہر تھا۔ مجھے صرف ایک پتلی سی لوہے کی تار کی ضرورت تھی۔ جو مجھے لانچ پر ایک جگہ سے مل گئی تھی اور میں نے اسے اس وقت اپنی جیب میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔ مجھے ساتھ والے کیبن سے تینوں تخریب کاروں کی باتیں کرنے کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ انتظار کی یہ گھڑیاں کافی کٹھن تھیں۔ مگر میں اس قسم کی سخت جانی کا عادی تھا اور یہ سخت جانی میری ٹریننگ اور میری ڈیوٹی کا حصہ تھی۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ پھر بھی میں مزید انتظار کرتا رہا۔ جب میرے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر چکی تھی تو میں آہستہ سے کیبن سے باہر نکلا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیبن کس طرف ہے جس میں اسلحہ اور گولہ بارود کا بکس رکھا ہوا ہے۔ چھوٹی سی لانچ تھی۔ اسلحہ والا کیبن میرے کیبن سے چند قدموں کے فاصلے پر کونے میں ہی تھا۔

میں سب سے پہلے تخریب کاروں کے کیبن کے پاس آیا۔ میں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر ان میں سے کسی کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ تینوں سو گئے ہیں تو میں وہاں سے ہٹ کر اسلحہ والے کیبن کے پاس آ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں نے جیب سے لوہے کی تار نکالی اور ٹٹول کر تالے کے سوراخ میں تار ڈال کر اسے خاص طریقے سے تین چار بار دائیں بائیں اور ایک مرتبہ اوپر نیچے گھمایا۔ تالا کھل گیا۔ میں دروازے کو بڑی آہستگی سے ذرا سا کھول کر کیبن میں آ گیا۔ کیبن میں بھی اندھیرا تھا۔ لیکن میں دن کے وقت اس کیبن میں رکھی ہوئی ہر شے

لے چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے اور چھوٹی میز کے کونے کو ٹٹول کر جگہ چلا گیا جہاں پہلے سے تیار کئے ہوئے چھ سات ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔

اس وقت اچانک مجھے خیال آ گیا کہ میرے پاس دیا سلائی والی ڈبیا موجود ہے۔ میں اپنی یاد داشت پر نفرین بھیجی۔ ایک کمانڈو کو ایسی باتیں ہر وقت اور خاص طور پر شن کے وقت یاد رکھنی چاہئیں۔ یہ نااہلی تھی کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ جیب میں س پڑی ہے۔ میں نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی اس کی روشنی میں ایک م اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ٹائمر بھی لگا ہوا تھا مگر سیکنڈ کے ہندسے جود نہیں تھے۔ میں نے ٹائمر کی سوئی کو ایک منٹ پر لا کر ٹائمر کا بٹن دبا دیا۔ دوسری دیا ائی جلائی تو دیکھا کہ ٹائمر نے چلنا شروع کر دیا تھا اور فریم میں شیشے کے پیچھے سیکنڈ کے ے ساتھ سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ٹائم بم کو اس بکس کے اوپر رکھ دیا ں بارود کی چھڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں کیبن سے یا۔ دروازے کو بند کر کے تالا یونہی لٹکایا اور دبے پاؤں چلتا تخریب کاروں کے کیبن گے سے گزر گیا۔ پھر لانچ کے اس زینے کی طرف آ گیا جو نیچے کھاڑی میں کھڑی کشتی ف جاتا تھا۔

ہاں لانچ کے ڈیک پر جلتے بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میرے پاس پچاس پینتالیس تھے۔ اس دوران مجھے وہاں سے دور نکل جانا تھا۔ نیچے سمندر میں کشتی نہیں تھی۔ ستہ سے کھاڑی کے پانی میں اتر گیا اور اندھیرے میں ساحل کی طرف تیرنے لگا۔ ی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ صرف ایک دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ان لوگوں کا بنایا دھوکا نہ دے جائے اور لانچ میں دھماکہ نہ ہو۔ کھاڑی کا کنارا زیادہ دور نہیں تھا۔ رے پر نکلنے کے بعد ایک طرف درختوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا اور لانچ کی طرف گا۔ ایک منٹ ہو چکا تھا مگر لانچ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اس وقت مجھے افسوس ا کہ مجھے گھڑی خریدنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ میرے پاس گھڑی کا ہونا بہت ی تھا۔

ابھی یہ سوچ میرے ذہن سے جدا نہیں ہوئی تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے بجلی چمک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکہ ہوا اور زمین ایک دفعہ اوپر ہو کر نیچے آگئی اور سمندر کی کھاڑی میں جہاں لانچ کھڑی تھی وہاں دھواں اور آگ کے سرخ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لانچ کے پرخچے اڑ چکے تھے اور میرے دیکھتے دیکھتے اس کے دونوں ٹکڑے سمندر میں ڈوب گئے۔ اب کھاڑی کے سمندر کی سطح پر صرف لکڑی کے جلتے دھواں دیتے ٹکڑے ہی کہیں کہیں تیر رہے تھے۔ گھاٹ پر جو لوگ جھونپڑیوں میں سوئے ہوئے تھے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آگ میں لپٹی ہوئی لانچ کے ٹکڑوں کو ڈوبتے دیکھ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دو ایک نے پانی میں چھلانگیں بھی لگا دیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تینوں تخریب کاروں میں سے کوئی زندہ تو نہیں بچا۔ مگر دھماکہ اتنا شدید تھا اور لانچ کے ٹکڑے جس طرح اڑ کر بکھر گئے تھے اس کو دیکھ کر یہ سوچنا بے کار تھا کہ لانچ میں کوئی انسان زندہ بچ گیا ہو گا۔

اس کے باوجود میں مرچنڈانی اور اس کے دونوں ہندو تخریب کاروں کی موت کی تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر کھاڑی سے دور بستی کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ دیر ادھر ادھر چل پھر کر وقت گزارا اور واپس بستی کے قریب ماہی گیروں کے جو جھونپڑے تھے اس طرف آگیا۔ وہاں جھونپڑوں کے باہر کچھ ماہی گیر لالٹین جلائے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور پوچھا۔

"یہ ادھر دھماکہ کیسا ہوا تھا؟"

پہلے تو ماہی گیر خاموش رہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"لانچ پھٹ گئی ہے جی۔ تیل کی ٹینکی میں آگ لگ گئی ہو گی۔"

میں نے پوچھا۔

"لانچ میں کتنے مسافر سوار تھے؟"

"کوئی مسافر نہیں تھا جی۔ یہ ہمارے مالک سیٹھ مرچنڈانی کی اپنی لانچ تھی۔"

"کیا سیٹھ صاحب لانچ میں تھے؟"

"بڑا برا ہوا جی۔ پر آدمی کی جب آئی ہوتی ہے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ سیٹھ صاحب کبھی رات کو لانچ میں نہیں سوتے۔ آج سنا ہے شہر سے ان کے دو تین مہمان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دوپہر کا اور پھر رات کا کھانا بھی لانچ پر ہی کھایا اور لانچ پر ہی اپنے دوستوں کے ساتھ سو گئے تھے۔"

دوسرا ماہی گیر افسوس کرنے لگا۔

"بڑا دکھ ہوا ہے"

میں نے کہا۔

"آپ لوگوں کو کیسے پتہ چلا کہ سیٹھ مرچنڈانی اور اس کے دوستوں کی موت ہو گئی ہے؟ ہو سکتا ہے وہ زندہ بچ گئے ہوں"

"سیٹھ جی اور اس کے دوستوں کی جلی ہوئی لاشیں کھاڑی میں مل گئی تھیں مگر کسی کی ٹانگیں نہیں تھیں تو کسی کے بازو اور نچلا دھڑ غائب تھا۔"

جب میری تسلی ہو گئی کہ تینوں بھارتی تخریب کار ہلاک ہو چکے ہیں تو میں وہاں سے واپس مایاوتی کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر تھا۔ مگر کراچی بڑا خوش قسمت اور رونق والا شہر ہے کہ وہاں رات کے وقت بھی دن کا سماں رہتا ہے۔ ہر سڑک پر ساری رات کوئی نہ کوئی ٹیکسی رکشا ضرور مل جاتا ہے۔ مجھے بھی ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت میں نے سوچا کہ اس وقت میرا مایاوتی کے ہوٹل میں جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ مجھے رات ریلوے سٹیشن پر گزارنی چاہیے چنانچہ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"سٹی سٹیشن چلو بھائی"

کراچی کے سٹی سٹیشن پر آدھی رات کے بعد بھی بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ صبح ہونے تک میں سٹیشن پر ہی رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھا پی آئی اے کے دفتر پہنچ کر رات کے بارہ بجے والی

اسلام آباد کی فلائٹ کا ایک ٹکٹ خریدا اور اس میں اپنی سیٹ کنفرم کروالی۔ اس کے بعد میں کلفٹن کی سیر کرنے نکل گیا۔ کلفٹن پر دن کے وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اسی لئے میں یہاں آگیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے کلفٹن پر ہی ایک کھوکھا ہوٹل میں کھایا۔ اس کے بعد سمندر کے کنارے کنارے سیر کرتا دور نکل گیا۔ وہاں پر بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا اور مایاوتی کو ٹھکانے لگانے کے منصوبے پر غور شروع کر دیا۔ ایک منصوبہ میرے ذہن میں خاکے کی شکل میں آگیا ہوا تھا۔ اس پر مزید غور کیا۔ آخر یہی منصوبہ محفوظ اور قابل عمل محسوس ہوا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر کے کلفٹن سے ٹیکسی لے کر شہر کے ایک ریستوران میں آکر بیٹھ گیا۔

مجھے شام تک کا وقت گزارنا تھا۔

جب شام ہو گئی تو ریستوران سے نکل کر مایاوتی کے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ مجھے وہاں سے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سیدھا ہوٹل کی دوسری منزل میں مایاوتی کے کمرے کی طرف آگیا۔ کمرہ بند تھا۔ ایک باوردی ویٹر قریب سے گزرا تو میں نے اس سے مایاوتی کا پوچھا۔ اس نے کہا۔

"وہ نیچے کچن میں گئی تھی۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ اگر وہاں ہوئی تو اسے اوپر بھیج دوں گا۔"

میں وہیں نیم روشن راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مایاوتی آگئی۔ وہ ہوٹل کی وردی میں تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس روز کے اخباروں میں کھاڑی میں ایک لانچ میں دھماکے کی خبر شائع ہو چکی تھی۔ وہ جو سوال قدرتی طور پر مجھ سے کرنے والی تھی میں نے اس کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

اس نے آتے ہی خاموشی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

"سر! آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

میں نے بے نیازی سے پوچھا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟"

اس نے کہا۔

"سر! مرچنڈانی کی لانچ میں دھماکہ ہوا ہے رات کو۔ اس کا کچھ پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔"

میں نے بھی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ ان لوگوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی۔"

مایاوتی کہنے لگی۔

"مرچنڈانی اسلحہ وغیرہ اپنی لانچ میں ہی رکھا کرتا تھا۔ کسی کی غلطی سے اس میں آگ بھڑک اٹھی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ سارے نااہل لوگ ہیں۔ ان لوگوں کو ان حماقتوں کی وجہ سے بھارت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچ رہا ہے۔"

مایاوتی کہنے لگی۔

"سر! کل آپ کس وقت مرچنڈانی سے ملے تھے؟"

"دن کے وقت ملا تھا۔ مجھے تو شکل سے ہی وہ غیر ذمے دار آدمی لگا تھا۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اگر مرچنڈانی لانچ میں موجود تھا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔ لانچ میں بارود کا دھماکہ ہو تو کوئی نہیں بچ سکتا۔"

مایاوتی نے کہا۔

"میں شام کو معلوم کر لوں گی کہ مرچنڈانی زندہ ہے یا نہیں"

اس نے جلدی سے بستر ٹھیک کیا اور بولی۔

"سر! آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ یہاں لیٹ کر آرام کریں۔ میں آپ کے لئے کافی لے کر آتی ہوں۔"

میں بستر پر لیٹ گیا اور کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی آج تھک گیا ہوں۔ کئی ایک ضروری کام نمٹانے تھے۔"

"میں ابھی کافی لے کر آتی ہوں"

وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اس عورت کو ٹھکانے لگانا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایک بار دل میں خیال ضرور آیا کہ اس عورت کو چھوڑ دوں۔ اسے ہلاک نہ کروں۔ لیکن جب اس نقطے پر غور کیا کہ اگرچہ اس کے سارے تخریب کار ساتھی ہلاک ہو چکے ہیں لیکن انڈیا سے دوسرے تخریب کار آجائیں گے اور آتے ہی اس سے رابطہ قائم کریں گے اور یہ عورت پھر سے پاکستان کے خلاف اپنی تخریبی سرگرمیاں شروع کر دے گی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس عورت کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری ہے۔ یہ کام میں رات کے وقت کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کراچی سے اسلام آباد کی رات کی فلائٹ میں سیٹ بک کرائی تھی۔ تاکہ جس وقت ہوٹل کے کمرے سے مایاوتی کی لاش برآمد ہو گی تو میں کراچی سے اسلام آباد پہنچ چکا ہوں گا۔

مایاوتی میرے لئے کافی لے آئی۔

کافی پی کر میری طبیعت میں واقعی فرحت سی پیدا ہو گئی۔ میں نے مایاوتی سے کہا۔

"مایاوتی! میں آج رات کا کھانا بھی تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ میرا پروگرام کل صبح اسلام آباد راولپنڈی جانے کا ہے"

مایاوتی مسکرانے لگی۔

"سر! آپ مالک ہیں۔ ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مایاوتی! تم نوکر نہیں ہو۔ تم بھارت ماتا کی دلیر پتری ہو۔ تم بھارت ورش کے لئے بڑا کام کر رہی ہو"

وہ میرے قریب ہو گئی اور کہنے لگی۔

"سر! تو پھر امرتسر سنٹر والوں سے میری سفارش کر دیں کہ جو فنڈ مرچنڈانی کو دیا جاتا ہے اس سے کم از کم آدھا مجھے دیا جائے۔ مجھے بعض خفیہ رپورٹیں حاصل کرنے کے لئے کافی رقم خرچ کرنی پڑ جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ یہ کام ہو جائے گا"

اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

"بس سر! اگر آپ یہ کام کر دیں تو میری زندگی سپھل ہو جائے گی۔"

اس عورت کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی زندگی یہی بس ایک رات ہی باقی رہ گئی ہے۔ اصل میں کسی کو بھی اس دنیا میں علم نہیں ہوتا کہ جس زندگی کے لئے وہ اتنی تگ ودو کر رہا ہے۔ اتنا لالچ کر رہا ہے۔ اتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ اتنے لوگوں کا حق مار رہا ہے۔ اتنی ناجائز دولت بینک میں جمع کر رہا ہے وہ زندگی کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔ آدمی کہتا تو ضرور ہے کہ جی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن حقیقت میں اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ کبھی نہیں مرے گا اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگر مایاوتی کو کسی طریقے سے معلوم ہو جاتا کہ میں اسے رات کے وقت قتل کرنے والا ہوں تو وہ کبھی مجھ سے اپنی زندگی کے لئے اور خوش حال پروگرام کا ذکر نہ کرتی اور مجھ سے امداد کی کبھی طالب نہ ہوتی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ زندگی کی رونق اسی وجہ سے قائم ہے کہ انسان نے موت کو بھلا رکھا ہے۔ اسے موت یاد نہیں۔ اسے ہر وقت یہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ مریں گے وہ نہیں مرے گا۔ جو لوگ اپنی موت کو اپنے سامنے دیکھ لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنی موت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں وہ لوگ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ کبھی رشوت نہیں لیتے۔ کبھی کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ کبھی کسی چیز کا لالچ نہیں کرتے۔ یہ لوگ صرف اس لئے زندہ ہوتے ہیں کہ اللہ نے ان کے ذمے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو آگے بڑھانے کا جو کام لگایا ہے اسے زندگی کے آخری لمحات تک ادا کرتے رہیں۔ یہ لوگ

صرف اللہ کا حکم بجا لانے کے لئے زندہ ہوتے ہیں۔ ان کا چلنا پھرنا' سونا جاگنا کاروبار کرنا
دنیا داری کرنا صرف اللہ اور اللہ کے واسطے ہوتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کے سب سے زیادہ
خوش و خرم لوگ ہوتے ہیں اور یقین کریں اس دنیا کی حقیقی رونقیں ان ہی لوگوں کی وجہ
سے لگی ہوئی ہیں میں نے مایاوتی سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور کہنے لگی۔

"میری ڈیوٹی تھوڑی دیر میں آف ہونے والی ہے۔ میں ابھی آجاؤں گی آپ کو کسی
چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا کر سروس والوں کو کہہ دیجئے گا۔"

وہ چلی گئی تو مجھے اس پر ترس سا آنے لگا۔ دراصل میں نے کسی عورت کو ٹھکانے
لگانے کے لئے کبھی اتنی لمبی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ بلکہ شاید یہ میرے ہاتھوں ہلاک
ہونے والی پہلی عورت تھی۔ جو لوگ میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ ہنگامی حالات میں
آناً فاناً ہلاک ہو گئے تھے اور یہ سب کچھ میں نے اپنے وطن پاکستان کی سلامتی اور قومی
مفاد میں کیا تھا اور اکثر ایسے حالات میں ایسا اقدام کیا تھا کہ اگر میں انہیں ہلاک نہ کرتا تو وہ
مجھے مار ڈالتے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی
دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ بہت غور کیا۔ کوئی دوسرا طریقہ نظر نہ آیا۔ یہ ایک تسلیم شدہ
حقیقت تھی کہ یہ عورت میرے وطن کی دشمن تھی۔ بھارت کی جاسوس تھی اور اب
تک اپنی تخریبی سرگرمیوں سے نہ جانے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچا چکی تھی اور زندہ رہنے
کی صورت میں نہ جانے اس نے ابھی مزید کتنا نقصان پہنچانا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی کہ باقی
بھارتی تخریب کاروں کی ہلاکت کے بعد اس عورت کی تخریبی سرگرمیاں معطل ہو جاتیں تو
مجھے اس سے دوسری بار ملاقات کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ایسی بات نہیں
تھی۔ لازمی امر تھا کہ بھارت کی خفیہ ایجنسی مرنے والوں کی جگہ دوسرے تخریب کار بھیج
دیتی۔ وہ لوگ مایاوتی سے آکر رابطہ پیدا کرتے اور یہ عورت دوبارہ تخریبی عمل شروع کر
دیتی۔ اب میرا فرض بن گیا تھا کہ پاکستان کی سرزمین کو اس دشمن کے وجود سے پاک

کروں۔

مایاوتی واپس آئی تو آتے ہی بولی۔

"سر! میں نے آپ کے لئے خاص طور پر چینی سوپ بنوانے کا آرڈر دیا ہے۔"

اس زمانے میں چینی کھانوں کا نیا نیا رواج چلا تھا اور لوگ ریستورانوں میں چینی
سوپ اور کھانے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے
الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے اور کہا۔

"سر! میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں"

وہ شاید ساتھ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہاں سے وہ وردی اتار کر دوسرے
کپڑے پہن کر آگئی۔ اس نے میک اپ بھی کر لیا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور
مرچنڈانی کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

کہنے لگی۔

"سر! ابھی تک مرچنڈانی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا مر
گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچا۔ اگر زندہ ہوتا تو اس وقت وہ ٹیلی فون پر ضرور
مجھ سے رابطہ قائم کرتا۔"

میں نے کہا۔

"شاید تھوڑی دیر تک اس کا فون آجائے۔"

وہ بولی۔

"سر! بھگت رام اور میلا رام جی کا بھی اس سلسلے میں کوئی فون نہیں آیا۔ ایسی ویسی
کوئی بات ہو جائے تو یہ لوگ مجھ سے خفیہ کوڈ میں ضرور فون پر بات کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ لوگ بھی مرچنڈانی کے ساتھ اسی لانچ میں ہوں اور یہ بھی ختم ہو
گئے ہوں۔"

مایاوتی نے کہا۔

"نہیں سر! وہ لوگ مرچنڈانی سے ملنے نہیں جاتے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔"

کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر ہوٹل کا ملازم کھانا لے کر آ گیا۔ مایاوتی نے بڑے اہتمام سے چینی سوپ کا پیالہ میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"سر! مجھے یقین ہے آپ اسے پسند کریں گے۔"

اب میں اس کی مہمان نوازی اور دل جوئی کی باتوں پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کراچی سے آخری فلائٹ پکڑ کر میں اسلام آباد جاؤں گا تو وہاں سے صبح کے وقت ہی مجھے آزاد کشمیر جانے والی کوئی بس مل سکے گی۔ میرا ارادہ اسی جانب سے کسی نہ کسی طرح مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کا تھا۔ دوسرا کوئی راستہ اس وقت میرے سامنے نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے پاکستان سے اب نکل جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ پر مجاہدین کو میری ضرورت تھی۔ میں اخباروں میں کشمیر کی خبریں پڑھتا تھا تو میرا خون کھول اٹھتا تھا۔ وہاں بھارتی فوجی کشمیریوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہے تھے اور انہوں نے اپنی وحشیانہ سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ اگرچہ مجاہدین بھی گھات لگا کر بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر رہے تھے مگر بھارتی سپاہی کشمیریوں کے گھروں کے گھر نذر آتش کر رہے تھے۔

مایاوتی نے الماری میں سے سکاچ کی باقی بچی ہوئی بوتل نکال لی اور بڑی محبت سے اصرار کرنے لگی کہ میں بھی اس کا ساتھ دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے زیادہ اصرار نہ کیا اور اپنے لئے گلاس میں شراب انڈیل لی۔ ہم کھانا کھانے لگے۔ مایاوتی حسب سابق تین ڈبل پیگ پی گئی تھی۔ وہ سرور میں آ گئی۔ میں برابر وقت دیکھتا جا رہا تھا۔ میری فلائٹ میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں عین وقت پر ایئرپورٹ پہنچنا چاہتا تھا۔ مایاوتی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے مزید شراب اپنے گلاس میں انڈیلی تو میں نے اسے منع نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اس کی وجہ سے اس کی موت آسان ہو جائے گی اور اسے مرنے کی تکلیف نہیں ہو گی۔

چوتھا پیگ پینے کے بعد اسے چڑھ گئی اور وہ اوٹ پٹانگ بولنے اور یونہی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ میں نے کہا۔

"مایاوتی اب تم سو جاؤ۔ میں جاتا ہوں۔"

اس نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"سر! آئی ایم سوری! سر! پلیز آئی ایم سوری!"

اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔

میں کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سب سے پہلے دروازہ کھول کر باہر راہ داری میں نگاہ ڈالی۔ راہ داری خالی پڑی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ میں نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی اور مایاوتی کو جھک کر دیکھا۔ وہ نشے میں دھت پڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ صوفے پر پڑا تھا۔ میں نے دوپٹہ اس کے گلے میں اچھی طرح سے لپیٹ دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو گرفت میں لیا اور دونوں انگوٹھوں سے اس کے نرخرے کو دبا دیا۔ مایاوتی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے پورا دباؤ ڈال دیا۔ گھٹنے اس کے سینے پر رکھ دیئے۔ میرے شکنجے میں آیا ہوا اس کا بدن بری طرح ہچکولے کھانے لگا۔ پھر اس میں لرزش پیدا ہو گئی اور پھر جسم بے حرکت ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ گردن سے الگ نہ کئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے تو میں نے ہاتھ اٹھا لئے۔

گردن پر دوپٹہ اس لئے ڈال دیا تھا کہ وہاں میری انگلیوں کے نشان نہ بن جائیں۔ بس یونہی یہ احتیاط کر لی تھی۔ ورنہ اس کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش تھی۔ پھر اس کی گردن کی بائیں جانب ذرا نیچے کر کے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ یہاں جو رگ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکا کرتی ہے وہ بھی خاموش تھی۔ پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اس کی الماری کی تلاشی۔ اس کی وہ کاپی دیکھی جس میں سے اس نے مجھے آج کے پاس ورڈ کے الفاظ پڑھ کر بتائے تھے۔ یہ عام قسم کی ڈائری نما کاپی تھی۔ اس میں کچھ مردوں کچھ عورتوں کے نام اور ان کے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں ورق گردانی کرتا چلا گیا۔ ایک جگہ انڈیا کی کسی فلم کے گیت بھی لکھے ہوئے تھے۔ ایک

ورق کو پلٹتے ہوئے میری نظریں رک گئیں۔ اس ورق پر لکھا ہوا تھا۔

پیارے ساجن کیلاش جی! تم مجھے اتنا کیوں تڑپاتے ہو۔ رات میں تمہیں یاد کر کے بہت روتی رہی۔ تم مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ اگر پریم کرتے ہو تو کرنل چڈھہ سے کہہ کر پنڈی سے اپنی ڈیوٹی کراچی میں کیوں نہیں لگوا لیتے؟ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے رہا کریں گے۔ میں کل رات کو تمہیں ٹیلی فون کروں گی۔ تمہاری بجنی مایاوتی"

اس کے نیچے ایک ٹیلی فون نمبر لکھا تھا اور ٹیلی فون نمبر کے ساتھ کیلاش چندر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کاپی میں سے وہ کاغذ پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر کاپی کا وہ صفحہ نکالا جس پر ایک ہفتے کے سات دنوں کے پاس ورڈ لکھے تھے۔ ہر پاس ورڈ کے آگے دن اور تاریخ ڈالی گئی تھی۔ میں نے کاپی کے اس صفحے پر سے اگلے چار دنوں کے پاس ورڈ الگ کاغذ پر لکھ کر اپنی جیب میں سنبھال کر رکھ لئے۔ کاپی کو الماری کے خانے میں رکھ دیا۔ الماری بند کی اور الماری پر جہاں جہاں میں نے ہاتھ لگایا تھا اس جگہ کو کپڑے سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ اسی طرح میں نے شیشے کے اپنے گلاس اور اپنے چمچ اور پلیٹ کے کناروں کو بھی کپڑے سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ ٹیبل لیمپ بجھا دیا۔ دروازے کی کنڈی اتار کر دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ راہ داری خالی تھی۔

میں خاموشی سے کمرے سے نکلا۔ راہ داری میں سے سر جھکائے گزر گیا۔ ہوٹل زینہ اتر کر اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے ہوٹل کے گیٹ سے گزر کر سڑک پر آگیا یہاں تین چار خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے ایئرپورٹ چلنے کو کہا ٹیکسی چل پڑی۔ جو کام مجھے کرنا تھا وہ خوش اسلوبی سے ہو گیا تھا۔ ایئرپورٹ پر کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد رات بارہ بجے والی فلائٹ پکڑی اور اسلام آباد پہنچ گیا۔ یہ اب مجھے ایک اور بھارتی جاسوس یا تخریب کار کیلاش چندر سے نمٹنا تھا۔ مایاوتی نے ڈائری میں اس کا یہی نام لکھا تھا۔ ڈائری کا یہ ورق میں نے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا اس پر کیلاش چندر کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ میرے پاس ان بھارتی تخریب کا

ے ٹولے کے سات دن کے پاس ورڈ بھی موجود تھے جو میں نے مایاوتی کی ڈائری سے نوٹ کئے تھے۔ اور پاس ورڈ سے مجھے بڑی آسانی سے کیلاش چندر کا اعتماد حاصل ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ پاس ورڈ ان تخریب کاروں کے سوا کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھے۔

میرے پاس اب اتنے پیسے باقی نہیں رہ گئے تھے کہ میں کسی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کمرہ لیتا۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل کو میں اس لئے ترجیح دیا کرتا تھا کہ ان ہوٹلوں میں آدمی کا ایک رعب سا قائم ہو جاتا ہے اور اگر وہاں پر خفیہ پولیس کا آدمی موجود بھی ہو تو وہ اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب کہ درمیانے درجے کے ہوٹلوں میں خفیہ پولیس ذرا سے شک شبے پر فوراً حراست میں لے لیتی ہے۔ ایئرپورٹ سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور راولپنڈی صدر میں آگیا۔ صدر میں ایک انگریزوں کے زمانے کا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل میں جدید ہوٹلوں والی سہولتیں تو نہیں تھیں مگر پرانے ہوٹلوں والا ایک خاص قسم کا مزاج اور فضا ضرور قائم تھی۔ عام طور پر یہاں انگریزوں کے زمانے کے ریٹائرڈ سی ایس پی افسران اور جاگیردار قسم کے وضع دار لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ اس ہوٹل کے اکثر کمرے خالی رہتے تھے۔ یہ ہوٹل اس زمانے میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ اب یہ ہوٹل باقی نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک شاپنگ پلازہ بن چکا ہے۔ دو سو روپے میں چوبیس گھنٹے کے لئے وہاں کمرہ مل جاتا تھا۔

میں نے اس ہوٹل میں آکر ایک کمرہ لے لیا اور سو گیا۔

دوسرے روز کافی دن نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں ہی منگوا کر ناشتہ کیا۔ پھر کیلاش چندر کا ٹیلی فون نمبر نکال کر سامنے رکھ لیا اور ٹیلی فون کرنے سے پہلے سوچنے لگا کہ اس بھارتی تخریب کار کو یہاں سے فون کرنا مناسب رہے گا یا کسی دوسری جگہ بنی کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کروں۔ کیونکہ اس بات کا خدشہ تھا کہ ہوٹل کی ایکسچینج والے میری باتیں سن لیں۔ میں نے ہوٹل کے کمرے سے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی شکل تھوڑی سی بدل لینی چاہیے۔ میں نے کمرے میں ہی حجام کو بلوا لیا۔ اس سے اپنی

چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی پوری صاف کرائی۔ سر کے لمبے بال چھوٹے کروالئے اور مونچھیں ذرا
ذرا رہنے دیں۔ میری شکل اب اتنی آسانی سے پہچانی نہیں جا سکتی تھی۔ اپنی پاکستانی
پولیس کو بھی میں اپنے ناکردہ گناہوں کے الزام میں مطلوب تھا۔

میں پنڈی صدر میں آگیا۔ ایک بازار میں پرانے گرم کپڑے فروخت ہو رہے تھے۔
یہاں سے میں نے اپنے لئے ایک امریکی گرم جیکٹ اور میل خورے رنگ کی پرانی پتلون
خریدی میں اپنا لباس بھی بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ کپڑے لفافے میں ڈالے اور صدر کے
پوسٹ آفس میں آگیا۔ یہاں ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ میں نے وہاں سے کیلاش چندر
کا نمبر ڈائیل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور
اٹھا کر ہیلو کہا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں براہ راست کیلاش چندر کا نام نہیں لینا
چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص کسی مسلمان کے نام سے یہاں رہ رہا ہو۔ میں نے
عورت کو نمبر بتایا اور پوچھا۔

"یہ آپ ہی کا نمبر ہے بیگم صاحب؟"

عورت نے کہا۔

"ہاں جی۔ یہ ہمارا ہی نمبر ہے۔ مگر گھر پر اس وقت کوئی نہیں ہے"

یہ نوکرانی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"صاحب کس وقت آئیں گے۔ میں ان کا بھائی بول رہا ہوں"

عورت بولی۔

"اچھا جی۔ صاحب اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں فون کر لیں"

میں نے اس سے فون نمبر پوچھا تو اس نے مجھے فون نمبر بھی کہیں سے دیکھ کر لکھوا
دیا۔ میں نے اس سے اس شخص کے دفتر کا ایڈریس بھی لکھوا لیا اور فون بند کر دیا۔

یہ دفتر صدر میں ہی ایک جگہ پر واقع تھا۔ میں وہ جگہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ اس کا
فائدہ بھی نہیں ہے کیونکہ اب نہ وہاں کیلاش چندر ہے نہ اس کا آفس ہی ہے۔ آپ کو تو
میری ایڈونچرس کہانی سے دلچسپی ہے۔ بس میری کہانی سنتے جائیے۔ میں پوچھتا پوچھتا

ک پر پہنچ گیا جہاں کیلاش چندر کا دفتر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نمبر پر بات کرنے والی گھر
نوکرانی نے اپنے جس صاحب کا ذکر کیا ہے وہ کیلاش چندر ہی ہے۔ مجھے اس کے
منے جانے کے بعد سب سے پہلے اس امر کی تصدیق کرنی تھی کہ کیا یہ کیلاش چندر ہی
ہے۔ یہ کام بے حد مشکل تھا مگر اس روز کا پاس ورڈ میری مشکل کو آسان بنا سکتا تھا۔ یہ
یکسپورٹ امپورٹ کا دفتر تھا۔ باہر چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ دفتر ایک دکان کے اندر بنایا گیا
۔ آدھے دروازے پر شیشے لگے تھے۔ ایک چپڑاسی باہر سٹول پر بیٹھا تھا۔ ایک آدمی دفتر
دروازے سے باہر نکلا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا کاریڈور تھا۔ ایک جانب
ڑی کی پارٹیشن والی دیوار تھی۔ دوسری دیوار پر سرجری کے آلات کی تصویریں لگی
یں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دفتر پاکستان میں تیار ہونے والے سرجری کے آلات باہر کے
وں کو ایکسپورٹ کرتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا
ا کہ کیا کیلاش چندر ہی اس دفتر کا مالک ہے یا وہ یہاں پر ہیڈ کلرک قسم کی کوئی چیز ہے۔
معلوم کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ کیونکہ مجھے کیلاش چندر کے اسلامی نام کا علم نہیں تھا جو
ں نے یہاں رکھا ہوا ہو گا۔ میں کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کیلاش چندر کا
لامی نام کا آدمی یہاں کہاں مل سکتا ہے۔ اتنے میں ایک چپڑاسی کونے کے سٹول پر سے
ٹھ کر میرے پاس آیا اور پوچھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے جناب؟"

مجھے نوکرانی نے اس علاقے کا نام بھی بتا دیا تھا جہاں میں نے فون کیا تھا۔ میں نے
ی سے اس علاقے کا نام لے کر پوچھا۔

"بھائی تمہارے صاحب اسی جگہ رہتے ہیں نا؟"

وہ بولا۔

"ہاں جی۔ مگر آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے صاحب ہی سے ملنا ہے۔"

اس نے کہا۔

"یہ کہیں ناں پھر۔ میرے ساتھ آئیں"

وہ مجھے پارٹیشن والے آخری کمرے کے پاس لے گیا۔ مجھے باہر رکنے کا اشارہ کیا اور
خود اندر چلا گیا۔ پارٹیشن کی دیوار چھ سات فٹ اونچی تھی۔ لکڑی کی دیوار تھی۔ اندر سے
چپڑاسی کی آواز آئی۔

"سر ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں"

"بھائی پھر انہیں اندر بلاؤ ناں"

چپڑاسی مجھے آکر اندر لے گیا۔

ڈبہ نما کمرے میں سنہری فریم کی عینک لگائے ایک خوش شکل مگر ڈھلتی عمر والا آدمی
انگریزی سوٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کاروبار
خندہ پیشانی کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ میں کافی پسند کروں گا یا چائے
اس شخص کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی ہو گی مگر چہرے کے نقش پر کشش تھے اور گ
بالوں میں سفید بالوں کی لکیریں اس کی شخصیت کو مزید پر کشش بنا رہی تھیں۔ میں نے
کہ مایاوتی سچی تھی۔ اسے اس آدمی سے ضرور محبت کرنی چاہیے تھی۔ کمرے میں دا
ہوتے وقت میں نے اس شخص کے نام کی باہر لگی ہوئی تختی پڑھ لی تھی۔ اس پر
غلام احمد لکھا ہوا تھا۔

مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ شخص اصل میں راجہ غلام احمد ہے یا کیلاش چندر
ہے۔ میں نے کہا۔

"صرف چائے منگوا لیجئے۔ ساتھ کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

اس نے چپڑاسی سے چائے لانے کو کہا۔ دفتر درمیانے درجے کا تھا۔ زیادہ آن بان
ھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کرتے ہوئے مجھے
گریٹ پیش کیا۔ میں نے شکریہ کہتے ہوئے سگریٹ لے لیا۔ ایک سگریٹ اس نے لے
یا۔ لائٹر سے پہلے میرا سگریٹ سلگایا پھر اپنا سگریٹ سلگانے کے بعد پوچھا۔

"فرمایئے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

اپنے سبھاؤ اور اردو کے الفاظ جو اس نے بولے تھے اس سے وہ کسی طرف سے بھی
ندو نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ بھی ہوا کہ شاید میں کسی غلط آدمی کے
س آگیا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"بات یہ ہے جناب کہ میں نے شارجہ میں اپنا ایک چھوٹا سا دفتر بنایا ہے۔ میں وہاں
یالکوٹ کے آلات سرجری اور سلور ویئر امپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کام زیادہ بڑا نہیں
ہے۔ اس لئے میں خود مارکیٹ کا جائزہ لینے شارجہ سے یہاں آیا ہوں۔ اور اس سلسلے میں
پ کا تعاون چاہتا ہوں"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

پھر اس نے مجھے ایک لسٹ نکال کر دی جس پر ہر قسم کے آلات سرجری اور سلور ویئر کی تصویریں تھیں اور نیچے ان کے نام اور نمبر لکھے ہوئے تھے۔ کہنے لگا۔

"ہم یہ مال آپ کو سپلائی کر سکتے ہیں۔ ہماری کمشن بھی معمولی ہو گی۔ آپ ہمیں اپنی پسند کے مال کا آرڈر دے دیجئے آپ کو ٹھیک وقت پر مال شارجہ پہنچا دیا جائے گا۔"

میں بات کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ کاروباری بات کرنی مجھے بالکل نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے ترپ کا پتا پھینک دینا چاہیے۔ میں نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ شارجہ میں میرے کاروبار میں ایک خاتون بھی شریک ہے۔ مجھے اسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اپنی طے شدہ کمشن پر آپ کو مال سپلائی کرنے کے پابند ہوں گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس خاتون کو جانتے ہیں"

وہ ذرا چونکا۔ پھر کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہو سکتا ہے۔ شارجہ میں ہمارے بہت سے جاننے والے رہتے ہیں۔ کیا نام ہے اس خاتون کا؟"

میں نے اس سے کاغذ پنسل لے کر کاغذ پر مایاوتی کا نام لکھا اور کاغذ اس کے آگے دیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس خاتون کو بہت زیادہ جانتے ہیں۔"

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مایاوتی کا نام پڑھتے ہی ایک سیکنڈ لئے اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ پھر فوراً ہی وہ مسکراہٹ واپس آ گئی نے کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھاتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"آئی ایم سوری سر! میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا۔ آپ کو غلط فہمی

ہے۔"

میں نے ترپ کا دوسرا پتا پھینکا۔ جیب سے مایاوتی کی ڈائری سے پھاڑا ہوا وہ کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے کیلاش چندر کو محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اس شخص نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اسے پڑھا مگر پھر بھی مجھے ہاتھ نہ پکڑایا۔ نفی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"جناب! یہ آپ مجھے کیا پڑھا رہے ہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔"

اب پاس ورڈ کا اعلان ضروری تھا۔ میں نے ڈائری والا کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھا اور سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے پاس ورڈ کا پہلا جملہ بولا۔

"میں نے کرشن جی مہاراج کو گوپیوں کے ساتھ داس رچاتے دیکھا ہے۔"

اب وہ شخص ٹھٹھک سا گیا۔ مگر پھر بھی اس نے زبان نہ کھولی۔ آدمی بڑا پکا لگتا تھا۔

ں نے ایک اور قدم بڑھایا۔

"مسٹر کیلاش چندر! میں امرتسر سنٹر سے آیا ہوں۔ میرا نام موھن داس ہے جب ت تم آج کے پاس ورڈ کا اس سے اگلا جملہ نہیں بولو گے مجھے کیسے یقین آئے گا کہ تم ہی رے آدمی کیلاش چندر ہو۔"

اس نے آہستہ سے پاس ورڈ کا اگلا جملہ بول دیا۔

"کرشن جی تو بندرا بن میں ہوتے ہیں۔"

میں نے پاس ورڈ کا تیسرا جملہ بولا۔

"میں نے کرشن کنہیا کی فلم دیکھی تھی"

تب اس نے میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"سر! آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہمیں یہاں پاکستان میں بڑا محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں ابھی کرنل چڈہ سے نہیں ملا۔"

وہ کہنے لگا۔

"سر! آپ کو مایاوتی کا یہ خط کہاں سے ملا؟"

میں نے کہا۔

"بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ مایاوتی کو رات قتل کر دیا گیا ہے۔ میں کل کراچی میں اس کے ہوٹل میں ہی تھا۔ اس وقت تک وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ کیونکہ مجھے یہاں پاکستان کے دارالحکومت میں اپنے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو زیادہ ہوشیاری اور عقل مندی سے ہمارے مشن کو آگے بڑھا سکے۔ یہاں پہلے جو لوگ کام کر رہے ہیں امرتسر سنٹر اور دلی ہیڈ کوارٹر والے ان کی کارگزاری سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں یہی مشن لے کر پاکستان آیا تھا۔ مایاوتی نے مجھے اپنی ڈائری میں سے تمہارا نام اور فون نمبر بتایا تو مجھے یہ محبت بھرا خط لکھا ہوا نظر آ گیا میں نے آج کا پاس ورڈ بھی مایاوتی سے لیا اور یہ خط بھی لے لیا تاکہ تم سے رابطہ قائم ہو سکے۔ مجھے رات کی فلائٹ سے اسلام آباد آنا تھا۔ میں کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے مایاوتی سے ملنے اس کے ہوٹل میں گیا۔ اس کا کمرہ کھلا تھا۔ اندر گیا تو مایاوتی کی لاش پلنگ پر پڑی تھی۔ میں وہاں سے فوراً نکل کر سیدھا ائیر پورٹ پر آ گیا۔"

کیلاش چندر مایاوتی کی موت پر اداس ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے کہا۔

"تم سب لوگ جو پاکستان میں کام کر رہے ہو ایک دوسرے سے عشق محبت کی پینگیں بڑھانے میں لگے ہو اور بھارت کا پیسہ ضائع کر رہے ہو۔"

کیلاش چندر جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"سر! ایسی بات نہیں ہے۔ مایاوتی خود ہی مجھ سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ میں نے تو کبھی اس کو ان کرج نہیں کیا تھا۔"

میں اب بڑے رعب سے بولنے لگا تھا۔ اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے کہا۔

"بہرحال ہمیں تم لوگوں کے بارے میں اچھی رپورٹیں نہیں مل رہیں۔ یہ ہمار-

کراچی کے مرچنڈانی کی غفلت کا نتیجہ ہے کہ مایاوتی کو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ میں مرچنڈانی کو بھی یہاں سے واپس بھجوا دوں گا۔"

میں نے کیلاش چندر کو بالکل نہ بتایا کہ اس کی لانچ میں پرسوں دھماکہ ہوا تھا اور وہ اس میں ہلاک ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کیلاش چندر اس خبر سے بے خبر ہے۔ شاید پنڈی کے اخبار میں یہ خبر نہیں چھپی تھی۔ ویسے بھی ان تخریب کاروں کا آپس میں صرف اس وقت رابطہ ہوتا تھا جب انہیں کوئی تخریبی کارروائی کرنی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے بے خبر رہتے تھے۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی بھی انہیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ صرف ان کے چیف کے ہاتھ میں ان کی ڈور ہوتی تھی اور وہ ان لوگوں کی ساری کارگزاریوں سے واقف رہتا تھا۔

کیلاش چندر بولا۔

"سر! میں تو اپنی ڈیوٹی پوری ذمے داری سے ادا کر رہا ہوں۔ پنڈی اور اسلام آباد کی تمام سرکاری اور سیاسی سرگرمیوں کی پوری رپورٹ بنا کر ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس پر خفیہ کوڈ میں ہر ہفتے روانہ کرتا ہوں۔"

اچھا تو یہ دشمن دیں یہاں بیٹھا یہ تخریبی کام کر رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ چپڑاسی چائے لے کر آ گیا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ چپڑاسی چائے کی پیالیاں رکھ کر چلا گیا تو میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"تمہاری پرفارمنس سے امرتسر سنٹر اور دلی ہیڈ کوارٹر بھی بہت حد تک مطمئن ہے۔ لیکن تم یہاں جس آدمی کے ذریعے سیاسی اور سرکاری سرگرمیوں کی خفیہ رپورٹیں حاصل کرتے ہو وہ تمہیں اپ ٹو ڈیٹ رپورٹیں فراہم نہیں کرتا۔ تمہاری اکثر رپورٹیں ایسی ہوتی ہیں جو یہاں ہمارا بھارتی سفارت خانہ پہلے سے ہی روانہ کر چکا ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو یہاں اس لئے رکھا گیا ہے کہ تم ہمیں وہ معلومات مہیا کرو جو ہمارا انڈین سفارت خانہ حاصل نہیں کر سکتا۔"

کیلاش چندر کو اب اپنی پڑ گئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس جاسوسی کے

عوض انڈین سفارت خانے کے یا کسی دوسرے ذریعے سے بھاری رقم ملتی ہے۔ یہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام تو محض ایک دکھاوا تھا۔ ایک ڈرامہ تھا۔ میں اس سے اس خاص آدمی کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس وطن دشمن کیلاش چندر کو حکومت کے تعمیری کاموں کی خفیہ رپورٹیں فراہم کرتا تھا۔ اس کام میں کوئی دشواری پیش نہ آئی اور کیلاش چندر نے مجھے اس شخص کا اصلی نام اور ایڈریس وغیرہ بتا دیا اور کہا۔

"سر! یہ آدمی اصل میں ہریانے کا ہندو ہے۔ پہلے انڈین ایمبیسی کے لئے کام کرتا تھا۔ اب کرسچین نام جیکب رکھ کر ہمارے لئے کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں آج ہی اس شخص کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ اسے فوراً یہاں بلواؤ"

کیلاش چندر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سر! اس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم خود اس کے پاس چلے جائیں گے۔ ہمیں یہاں کی سی آئی ڈی سے بہت خبردار ہو کر رہنا پڑتا ہے سر!"

میں نے کہا۔

"وہ کہاں ملے گا؟"

کیلاش چندر نے کہا۔

"وہ شہر سے چھ سات میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ میں اسے فون پر پیغام پہنچا دوں گا کہ وہ آج شام کہیں نہ جائے اور گھر پر ہی رہے۔ وہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا سر۔ ہم شام کو یہاں سے چلے چلیں گے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سورج غروب ہونے کے بعد یہاں تمہارے دفتر میں آجاؤں گا یہیں سے جیکب کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اب میں جاتا ہوں۔ مجھے کچھ اور ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

کیلاش چندر مجھے چھوڑنے دفتر کے دروازے تک آیا۔ میں شام کو آنے کا کہہ

وہاں سے اپاس چل پڑا۔ میری یہ مہم بھی مکمل طور پر بخیر و خوبی انجام کو پہنچ گئی تھی۔

وہاں سے میں نے ایک ویگن پکڑی اور اسلام آباد پہنچ گیا۔ میں راولپنڈی میں رہ کر پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسلام آباد کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے پی۔ کچھ وقت وہاں گزارا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ کچھ وقت وہاں بیٹھا رہا۔ دوپہر کو اسی ریستوران میں کھانا کھایا۔ شام تک اسی ریستوران میں رہا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو ویگن میں سوار ہوا اور سیدھا کیلاش چندر کے آفس میں آگیا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

کہنے لگا۔

"سر! میں نے جیکب کو اطلاع پہنچا دی تھی۔ وہ گھر پر ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"تو پھر چلو"

کیلاش چندر کے پاس پرانے ماڈل کی ایک فیٹ کار تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ راولپنڈی شہر سے نکلے تو شام کا اندھیرا ہو چکا تھا۔ جیکب کا مکان ایک دور افتادہ بستی میں تھا۔ وہ اپنے مکان کی بیٹھک میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے گہری نگاہ سے جیکب کو دیکھا۔ دبلا پتلا سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ شکل ہی سے بڑا عیار لگ رہا تھا۔ کیلاش چندر نے میرا تعارف کرایا تو اس نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا۔ ہم مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے یونہی سوال جواب شروع کر دیئے۔ پہلے تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ پھر ذرا اس نے اپنے اندر اعتماد پیدا کیا اور میرے سوالوں کا جواب سوچ سمجھ کر دینے لگا۔ میں نے اس کی خوب سرزنش کی کہ وہ پرانی اور غلط رپورٹیں فراہم کرتا ہے۔ اس نے بہت سی وضاحتیں کیں کہ اس کے ذرائع محدود ہیں۔ اسے زیادہ فنڈ مہیا کئے جائیں۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں یہ معلوم کر لیا کہ وہ اکیلا ہی یہ کام کرتا ہے۔ اس جاسوسی میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شامل نہیں ہے۔ میں نے پوچھ گچھ میں کافی دیر لگا دی۔ میں چاہتا تھا کہ رات جتنی گزر سکتی ہے گزر جائے رات کے دس بجے ہم نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد

میں نے جیکب سے کہا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ پنڈی چلنا ہو گا۔ میں تمہارا اور کیلاش کا تعارف کرنل چڈہ سے کرانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارے فنڈ میں اضافے کی بات کی جاسکے۔"

کیلاش اور جیکب دونوں فنڈ میں اضافے کا سن کر خوش ہوئے۔ کوئی گیارہ بجے رات ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس پنڈی کی طرف چل پڑے۔ میں نے ساری سکیم پہلے ہی سوچ لی تھی۔ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا۔ جب گاڑی راولپنڈی شہر کے قریب ایک پرانے نالے کے پل کے پاس پہنچی تو میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"یہاں ایک طرف اندھیرے میں گاڑی روکو"

اس نے کچی سڑک پر سے گاڑی اتار کر اندھیرے میں درختوں کے پاس کھڑی کر دی۔ میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ"

وہ گاڑی سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے اسے کہا۔

"یہاں ہماری ایک خفیہ جگہ ہے جہاں ہم نے ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے ریڈیو ٹرانسمیٹر چھپایا ہوا ہے۔ میں کرنل چڈہ کو وائرلیس پر اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس کے پاس آرہے ہیں۔"

یہاں زمین اونچی نیچی اور سنگلاخ تھی۔ ہم برساتی نالے کے چھوٹے سے پل پر سے گزر کر دوسری طرف آگئے۔ یہاں اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"وہ سامنے کوٹھڑی ہے۔ میں وہاں جا کر وائرلیس پیغام کرنل چڈہ کو دے کر ابھی آتا ہوں۔ تمہیں اس لئے ساتھ لایا ہوں کہ اگر کرنل چڈہ نے تم سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں تمہیں بلالوں۔ تم یہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے کیلاش چندر کو خاص طور پر ایسی جگہ بیٹھنے کو کہا تھا جہاں اس کے پیچھے نالے کی ڈھلان تھی اب میں نے دیکھا کہ وہ بیٹھ گیا ہے تو میں رات کے اندھیرے میں اس

کوٹھڑی کی طرف چلا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کچھ دور تک اندھیرے میں چلنے کے بعد میں رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کیلاش چندر مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں وہاں سے ایک طرف ہٹ کر دس پندرہ قدم چلا اور اوپر سے ہوتا ہوا واپس اس طرف چل پڑا جہاں میں نے کیلاش چندر کو بٹھایا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ میں اور دوسری طرف ہٹ گیا۔ یوں ایک جگہ سے میں پل کی جانب ہو کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں کیلاش چندر کی پشت پر نکل آیا۔ اب میں بڑی احتیاط سے اس طرح قدم اٹھانے لگا کہ میرے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کیلاش چندر بھی کوئی آواز نکال سکے۔ میرا یہ دشمن بلکہ میرے وطن پاکستان کا دشمن اس وقت مجھے ایک چھوٹا سا ممنہ معلوم ہو رہا تھا۔ جس کو ٹھکانے لگانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ صرف اس بات کی احتیاط کر رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے حملہ آور ہوتا دیکھ کر شور نہ مچادے یا کوئی ایسی آواز حلق سے نہ نکال دے کہ جس کو سن کر دوسرا آدمی یعنی پاکستان کا دشمن جیکب وہاں سے گاڑی لے کر فرار نہ ہو جائے۔ اگر وہ فرار ہو جاتا ہے تو پھر اس کا دوبارہ ہاتھ آنا تقریباً ناممکن تھا۔

میں جھک کر دبے پاؤں چلتا کیلاش چندر کے پیچھے سے اس کی جانب برابر بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے ایک قدم کے فاصلے پر پہنچا اس نے شاید میری آہٹ سن لی تھی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس نے شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کی گردن اپنی گرفت میں لے لی اور بائیں بازو کے شکنجے میں کس کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ پہلے تو مجھے لگا کہ اس کی گردن الگ ہو گئی ہے۔ مگر گردن الگ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے وہیں زمین پر لٹا کر اس کی گردن کو ہاتھ سے ٹٹول کو دیکھا۔ مجھے اس کی گردن کی ہڈی کہیں نہ ملی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ کر نیچے چلی گئی تھی یا اس کی گردن کی کھال کافی اوپر کو کھنچ گئی تھی۔

مجھے لاش ٹھکانے لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس دشمن پاکستان کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور اندھیرے میں غور سے دیکھتا ہوا نالے کے پل پر سے ہو کر اس

جگہ پر آگیا جہاں جیکب گاڑی میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اکیلے آتے دیکھا تو گاڑی کی کھڑکی میں سے سر باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"سر! کیلاش بابو کہاں ہیں؟"

میں نے اسے کہا۔

"وہ کرنل صاحب کے پاس ہے۔ تم بھی آجاؤ کرنل چڈھ نے تمہیں بھی بلایا ہے۔"

میں نے جیکب کو زیادہ دور چلنے کی تکلیف نہ دی۔ جیسے ہی وہ گاڑی میں سے نکل کر دو قدم آگے بڑھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں اپنا بازو ڈال کر اوپر کو کھینچتے ہوئے یکے بعد دیگرے تین جھٹکے دیئے۔ وہ بھی میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اس کی لاش بھی وہیں زمین پر اندھیرے میں ڈال دی اور خود فیٹ گاڑی میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر کے واپس موڑا اور راولپنڈی شہر کی طرف سڑک پر ڈال دیا۔

ابھی راولپنڈی کی روشنیاں کچھ فاصلے پر تھیں اور بڑی سڑک بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے فیٹ گاڑی کو وہیں ایک طرف چھوڑا اور خود بڑی سڑک پر آکر پنڈی شہر کی طرف چلنے لگا۔ پیچھے ایک لاری شاید لاہور سے آرہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ بس کی روشنی مجھ پر پڑی تو ڈرائیور نے ذرا آگے جا کر بس روک لی۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور راولپنڈی کے پہلے بس شاپ پر اتر گیا۔ یہاں سے میں ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہی ایک لاری اڈہ ہے جہاں سے لاریاں آزاد کشمیر کی طرف جاتی ہیں۔ مگر یہ لاریاں دن کے وقت چلتی تھیں۔ مجھے رات گزارنی تھی۔ میں وہاں سے اپنے ہوٹل والے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہیں سٹیشن کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ دو تین مسافر پہلے سے وہاں آرام کر رہے تھے۔ ایک بید کا دیوان خالی پڑا تھا۔ میں اس پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو میں اٹھ کر باہر پلیٹ فارم پر آگیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس حالت میں میرا غافل ہو کر سو جانا میرے حق میں خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر چائے کا سٹال کھلا ہوا تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر چائے کا ایک گرم

کپ پیا۔ نیند غائب ہو گئی۔ وہیں ایک طرف ہو کر سگریٹ پیتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ مجھے آزاد کشمیر کی پہاڑیوں سے سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر پہنچنا تھا۔ اس سے پہلے میں اس طرف سے کبھی مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ خیال تھا کہ میں اندازے سے نکل جاؤں گا۔ پہاڑیوں میں سے نکلنا میدانی علاقے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ یہی ایک راستہ میرے سامنے تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے کافی وقت وہاں گزار لیا۔ صبح چار بجے باہر آکر معلوم کیا تو دیکھا کہ ایک لاری آزاد کشمیر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور لاری میں بیٹھ گیا۔

آگے کی روداد میں آپ کو نہیں سناؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں کسی نہ کسی طرح پہاڑیوں گھاٹیوں اور کھائیوں میں سے ہوتا ہوا پورے ایک دن اور ایک رات میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک کشمیری کسان نے مجھے کشمیری زبان میں بتایا کہ میں مقبوضہ کشمیر میں ہوں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہاں سے سری نگر پہنچنا آسان تھا۔ میں اس علاقے کا نام نہیں بتاؤں گا جہاں میں سیز فائر لائن کراس کرنے کے بعد پہنچا تھا۔ اس مقام سے سری نگر پہنچنے میں مجھے مزید دو دن لگ گئے۔ کوئی لاری بس وغیرہ وہاں نہیں تھی۔ مجھے پیدل ہی سفر کرنا پڑا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا جب میں سری نگر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ میں اندھیرا ہونے کے بعد کمانڈر شیروان کے خفیہ ٹھکانے پر جانا چاہتا تھا۔ سارا علاقہ میرا جانا پہچانا تھا۔ میں سری نگر شہر کے پہلو سے گزرتا ہوا شمال مشرق کی جانب جو پہاڑیاں تھیں ان کی دامن میں آکر ایک جگہ بیٹھ گیا اور اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سورج گلمرگ کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وادیوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ جب شام گہری ہو گئی تو میں خفیہ ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ دو تین گھاٹیوں میں سے نکلنے کے بعد جب خفیہ ٹھکانے والی پہاڑی کا موڑ آیا تو میں ایک چٹان کی اوٹ میں ہو کر اندھیرے میں ان درختوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا جن کے پیچھے مجاہدین کا ہائیڈ آوٹ تھا۔ ایسا میں نے احتیاط کے پیش نظر کیا تھا۔ کیونکہ کشمیر میں جنگ لڑی جا

رہی تھی اور حالات کوئی بھی شکل اختیار کر سکتے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ حالات پر
سکون ہیں تو میں ہائیڈ آؤٹ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی میں درختوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ
اچانک کسی نے پیچھے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں
مجھے ایک نوجوان نظر آیا جس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور منہ سر سیاہ رومال میں
چھپا رکھا تھا۔ یہ سوائے اپنے حریت پسند مجاہد کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر یہ کہتا ہوا ایک طرف لے گیا کہ
جلدی سے اس طرف آجاؤ۔ وہ تیز تیز چلاتا چٹانوں کے پیچھے لے گیا اور اپنے ساتھ مجھے
بھی زمین پر بٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں میرا نام لے کر بولا۔

"یہاں معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ کسی نے مخبری کر دی تھی۔ بھارتی فوج کی ایک
پلاٹون نے اچانک حملہ کر دیا۔ ہم نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ مگر ہماری نفری بہت کم
تھی۔ ہمارے چھ ساتھی شہید ہو گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی شہید ہو گیا۔ بھارتی مارٹر
فائر کر رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھارتی ایک دم سے ہمارے اوپر آگئے تھے۔ ہم نے کمانڈر شیروان کے گرد حفاظتی
گھیرا ڈال لیا اور چاروں طرف فائرنگ شروع کر دی مگر بھارتی سپاہیوں کی دو ایک پلاٹوا
وہاں پہنچ گئیں۔ کمانڈر شیروان سامنے نکل کر فائرنگ کرنے لگے۔ ہم نے انہیں بہت کو
کیا مگر ہم پر مشین گنوں کے علاوہ مارٹر کا فائر بھی آرہا تھا۔ کمانڈر شیروان زخمی ہو کر
پڑے۔ ان کے باڈی گارڈ پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ میں ایک چٹان کی آڑ لے کر مسلس
فائر کر رہا تھا مگر میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔"

"کمانڈر شیروان کہاں ہیں اب؟"

میں نے پوچھا۔ مجاہد نے کہا۔

"افسوس! کمانڈر کو بھارتی فوجیوں نے زخمی حالت میں اٹھا لیا اور گرفتار کر کے

گئے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"بیس دن ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے خفیہ ٹھکانے میں چلے گئے ہیں۔ میں یہاں
ہر روز رات کو ڈیوٹی دیتا ہوں تا کہ اگر آپ اس طرف آئیں تو میں آپ کو یہیں روک
لوں۔ کیونکہ آگے بھارتی فوج نے اپنے آدمی بٹھا دیئے ہیں کہ اگر کوئی مجاہد ان جانے میں
اس طرف آجائے تو اسے بھی پکڑ لیا جائے۔ میرے ساتھ آجائیں۔ اچھا ہوا کہ آپ دن
کے وقت ادھر نہیں آئے۔ میرے ساتھ چلیں۔"

ہم دوسری طرف گھاٹی اترنے لگے۔ میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"کچھ معلوم ہے کمانڈر شیروان کو فوج کس جگہ لے گئی ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"ہم نے اپنے آدمی دوڑا دیئے ہیں۔ مگر ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ بھارتی ملٹری
انٹیلی جینس نے کمانڈر کو کہاں رکھا ہوا ہے۔"

پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتے ہم وادی کی دوسری جانب ایک بہت اونچے
پہاڑ کے پاس آکر رک گئے۔ یہاں اندھیرے میں سے کچھ مسلح مجاہد نکل کر ہماری طرف
بڑھیں۔ میرے ساتھی مجاہد نے ان سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔"

پہاڑ کے اندر ایک قدرتی غار تھا۔ اس غار میں مجاہدین نے اپنا نیا خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا
تھا۔ یہ مجاہدین کشمیری کمانڈو تھے جن کا کام گھات لگا کر بھارتی فوجیوں کے سپلائی لے جانے
والے ٹرکوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنا' بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنا اور رات کو بھارتی
فوجیوں کے اسلحہ خانوں اور پٹرول کے ذخیروں کو اڑانا تھا۔ کمانڈو شیروان ہمارا کمانڈر تھا۔
مجھے کمانڈو اورنگ زیب کی شہادت سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہاں جتنے کمانڈو
مجاہد تھے وہ سارے میرے پاس آگئے۔ میں نے ان سے کمانڈر شیروان کے بارے میں
دریافت کیا۔ کمانڈر منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"ہمارے تین آدمی کمانڈر کا سراغ معلوم کرنے کے لئے جموں گلمرگ اور کٹھوعہ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ خیال ہے کہ صبح تک ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آکر خبر دے گا۔"

رات کو میں وہیں دوسرے مجاہدین کے ساتھ سو گیا۔ صبح صبح ہم اٹھ بیٹھے۔ سب مجاہدین نے نماز فجر ادا کی۔ میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہمیں کمانڈر شیروان کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ بھارتیوں نے اسے زخمی حالت میں کس جگہ پر رکھا ہوا ہے۔ ابھی تک ہمارا کوئی آدمی بھی نہیں آیا تھا۔ کمانڈر منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کمانڈر کو یہ لوگ جموں انٹیروگیشن سنٹر میں لے گئے ہیں اس علاقے میں سب سے بڑا یہی انٹیروگیشن سنٹر ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر شیروان زخمی ہے۔ بھارتی اس پر مزید تشدد کر رہے ہوں گے۔ ہمیں پتہ چل جائے تو ہم کمانڈر کو اپنی جان کی بازی لگا کر وہاں سے نکال لائیں گے"

کمانڈر منصور احمد بٹ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کئی کامیاب کمانڈو آپریشن کر چکا ہے اور اس نے اب تک سینکڑوں بھارتی فوجیوں کو جہنم واصل کیا ہے۔ ہم نے سبز چائے کے ساتھ نمکین قلچوں کا ناشتہ کیا۔ دن کے دس بجے کے قریب اپنا ایک آدمی آگیا۔ اس نے بتایا کہ کمانڈر کو بھارتی فوجی امرتسر جیل میں لے گئے ہیں۔

"تمہاری اطلاع کہاں تک درست ہے"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے اس سے پوچھا۔ مجاہد نے کہا۔

"جس آدمی نے مجھے بتایا ہے اس نے اپنی آنکھوں سے کمانڈر کو امرتسر جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی میں دیکھا ہے۔ کمانڈر کو جیل کے ہسپتال میں بھی رکھا گیا تھا۔ جب گولی کا زخم ٹھیک ہو گیا تو اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔"

"امرتسر جیل کے ٹارچر سیل تو بڑے بدنام ہیں وہاں سے کوئی مجاہد زندہ باہر نہیں

آتا"

ایک مجاہد نے کہا۔

"ہمیں ابھی امرتسر جیل کی طرف چل پڑنا چاہیے۔ چاہے ہماری جانیں چلی جائیں ہم رات کو اٹیک کر کے کمانڈر کو چھڑا لے لائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر ہمیں اس وقت جذبات سے نہیں عقل مندی اور دور اندیشی سے کوئی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اپنے کمانڈر کو بچانے کی کوشش میں الٹا ہم بھی وہاں پھنس سکتے ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تم ہم سب میں زیادہ تجربہ کار ہو۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔"

یہ میں نے ان لوگوں کے لئے کہہ دیا تھا ورنہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے خود کمانڈر شیروان کی مدد کے لئے امرتسر جانا تھا۔ یہ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا جب مجھے پتہ چلا تھا کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی فوجی امرتسر لے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی فوج نے پکڑا ہے اور وہی اس سے پوچھ گچھ بھی کرے گی پھر اسے امرتسر چھاؤنی کی بجائے امرتسر جیل میں کیوں لے گئے ہیں۔ یہ بات امرتسر کے رہنے والوں اچھی طرح معلوم ہو گی کہ امرتسر شہر میں ایک چھاؤنی بھی تھی۔ اگرچہ اس نام کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں تھا۔ جیسا کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں فوجی چھاؤنیوں کے الگ ریلوے سٹیشن ہوتے ہیں جس طرح انبالہ شہر اور انبالہ چھاؤنی' میرٹھ شہر اور میرٹھ چھاؤنی وغیرہ۔ امرتسر میں چھاؤنی ضرور تھی مگر اس کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں تھا۔ یہ چھاؤنی شہر سے مغرب کی جانب واقع تھی اور شہر کے بہت قریب بلکہ شہر میں ہی تھی۔ دوسرے شہروں کی چھاؤنیوں کا کوئی قلعہ شاید ہی ہو مگر امرتسر

چھاؤنی کا ایک قلعہ بھی تھا اور چھاؤنی قلعے کے اندر ہی تھی۔ اس قلعے کے باہر ایک ریتلا بغیر گھاس کے میدان تھا جس کو قلعے کی پریڈ کہتے تھے۔ بچپن میں ہم مجیٹھے سے امرتسر شہر میں جب آئے تھے تو اس میدان میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال اور گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے اس قلعے میں گوروں کی پلٹنیں رہا کرتی تھیں۔ یہ قلعہ امرتسر کے ہاتھی دروازے کے آگے لاہوری دروازے کے باہر جو سڑک ریلوے کے پل ریگو برج کی طرف جاتی تھی اس کی ایک طرف تھا۔ آگے جی ٹی روڈ تھی جو لاہور کو جاتی تھی۔ یہاں قلعے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے پار ایک چھوٹا سا سینما گھر تھا جو گورے فوجیوں کے لئے بنایا گیا تھا اور جہاں انگریزی فلمیں چلا کرتی تھیں۔ انگریزوں کے جانے کے بعد یہاں انڈیا کی فوج رہنے لگی تھی اور اس سینما گھر میں انگریزی کے علاوہ بھارتی فلمیں بھی چلنے لگی تھیں۔ اس سینما ہاؤس کے پیچھے کھیت تھے اور ان کھیتوں میں سکھوں کے خالصہ کالج کی پرانی طرز کی شاندار عمارت تھی۔ امرتسر میں اپنا ایک مجاہد پہلے سے لاہور کی جانب جاتی سڑک یعنی جی ٹی روڈ پر ایک انڈین سینما ہاؤس کے قریب دائم گنج کی بستی میں دکان کرتا تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ دائم گنج میں قیام پاکستان سے پہلے مسلمان رہا کرتے تھے مگر پاکستان بنا تو ان میں سے اکثر مسلمان گھرانوں کو سکھوں ہندوؤں نے شہید کر دیا جو باقی بچے تھے وہ جانیں بچا کر پاکستان چلے گئے تھے۔ اب اس بستی کے مکانوں میں زیادہ تر سکھ شرنارتھی آباد تھے۔ اس بستی میں ہمارا آدمی ہندو بن کر دکان کرتا تھا۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ یہ مجاہد فوٹوگرافی کی دکان کرتا تھا۔ یہ میں نے فرضی طور پر کہہ دیا تھا۔ حقیقت میں وہ کوئی اور کام کرتا تھا۔ اگرچہ اب وہ مجاہد دائم گنج میں نہیں رہتا اور اپنے مشن کی مدت پوری کرنے کے بعد جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے واپس مقبوضہ کشمیر چلا گیا ہے لیکن جس زمانے کی میں یہ داستان بیان کر رہا ہوں اس زمانے میں وہ دائم گنج میں ہی تھا۔ میں کمانڈر شیروان کو جیل سے فرار کروانے میں اپنے اس مجاہد سے مدد لے سکتا تھا۔ اس قسم کے مشن کے لئے ایسے ایک آدمی کا موجود ہونا بڑا مفید ہو

چنانچہ کچھ دیر بعد جب میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ کو بتایا کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی قید سے آزاد کرانے کے لئے میں خود امرتسر جاؤں گا تو وہ بولا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا"

میں نے ایک لمحے کے لئے غور کرنے کے بعد کہا۔

"کمانڈو منصور! اس مشن کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ تمہارے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری یہاں زیادہ ضرورت ہے۔"

مگر وہ ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دوست! تم بہت جوشیلے آدمی ہو۔ یہ جوش جنگ کے محاذ کے لئے تو بڑا کار آمد ہے مگر کمانڈو مشن میں یہ جوش آدمی کو الٹا مروا بھی دیتا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"خدا کی قسم میں جتنا جوشیلا کشمیری مسلمان ہوں اتنا ہی متحمل مزاج بھی ہوں۔ اگر تم مجھے ساتھ نہ لے گئے تو میں اپنے طور پر اکیلا ہی اپنے کمانڈر کو بھارتیوں کی قید سے رہا کروانے کے لئے چلا جاؤں گا"

میں نے سوچا کہ اس آدمی سے کوئی بعید نہیں کہ ادھر میں اس مشن پر روانہ ہو جاؤں اور میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد یہ بھی اس مشن پر چل پڑے۔ یوں ہم دونوں کا کام خراب ہو سکتا تھا۔ بلکہ بہت ممکن تھا کہ ہم دونوں ہی وہاں کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ میں نے بھی بہتر سمجھا کہ چلو اس کو ساتھ لئے چلتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے دوست! اگر تم اس مشن پر ضرور جانا چاہتے ہو تو پھر اکیلے جانے سے بہتر ہے کہ میرے ساتھ چلو"

کمانڈو منصور بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں اپنے ساتھ کیا کیا چیزیں لے جانی ہوں گی؟"

میں نے اسے کہا۔

"یہ اگر کوئی فوجی آپریشن ہوتا اور ہم دشمن کا کوئی پٹرول یا ایمونیشن کا ذخیرہ یا پل اڑانے جا رہے ہوتے تو ہمیں دستی بموں ٹائم بموں اور دوسرے چھوٹے اسلحہ کی ضرورت ہوتی مگر یہ ایک دوسری قسم کا کمانڈو آپریشن ہے۔ اس میں اسلحہ کی بجائے دماغ کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ ہاں ایک دو آٹو میٹک پستول اور کچھ میگزین ساتھ لے چلیں گے۔ باقی جس چیز کی ضرورت ہو گی امرتسر میں اپنا ایک آدمی بیٹھا ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تو تم ہمارے مجاہد سے مل چکے ہو۔ میرا خیال تھا شاید تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔ وہ ہمارا بڑا جانباز حریت پرست ساتھی ہے اور امرتسر میں کئی برسوں سے اپنے لئے کام کر رہا ہے اور اس کے ذریعے ہمیں بھارتی فوجوں کی تازہ نقل و حرکت اور ان کی کشمیر کے فوجی منصوبوں کے بارے میں بڑی مفید رپورٹیں ملتی رہتی ہیں۔"

میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ کو زیادہ بتانا ضروری نہ سمجھا۔ بس یہی کہا کہ ہاں میں دو ایک بار اس مجاہد کے پاس تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا تھا اور اس کے بارے میں مجھے کمانڈر شیروان نے ہی بتایا تھا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے کہا۔

"میرے ذہن میں بھی اپنے امرتسر والے مجاہد کا ہی خیال تھا۔ وہ اس مشن میں ہمارے کام آسکتا ہے۔ باقی ہم یہاں سے دو آٹو میٹک پستول ساتھ لیتے چلیں گے۔ بھارتی فوج کا ہم نے کافی اسلحہ چھین کر رکھا ہوا ہے۔"

ہم نے اپنے کمانڈو مشن پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کسی زیادہ تیاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے کپڑے کشمیر کی پہاڑیوں میں پیدل سفر کرنے سے کافی پھٹ گئے تھے۔ میری گرم جیکٹ بھی خراب ہو رہی تھی۔ میں نے ایک گرم جیکٹ اور پرانی مگر صاف ستھری میل خورے رنگ کی پتلون پہن لی۔ کمانڈو کبھی بھڑکیلے اور شوخ رنگوں والے کپڑے نہیں پہنتا۔ خاص طور پر جب وہ کسی مشن پر جاتا ہے تو گہرے اور میل خورے رنگ کی پتلون جیکٹ پہن لیتا ہے۔ اندھیرے میں یہ لباس نمایاں ہو کر دکھائی

نہیں دیتا۔ جب کہ شوخ رنگوں پر دن کے وقت بھی لوگوں کی ضرور نظر پڑتی ہے۔ ہم نے کچھ انڈین کرنسی اور ایک ایک آٹو میٹک پستول اور کچھ میگزین ساتھ رکھ لیے۔ ہر میگزین میں بارہ بارہ گولیاں تھیں جس کو پستول کے اندر خالی میگزین نکال کر چڑھا دیا جاتا تھا۔ یہ آٹو میٹک پستول نئے نئے بھارتی فوج کے پاس آئے تھے جو کشمیری مجاہدین نے ایک اسلحہ ڈپو پر شب خون مار کر دوسرے اسلحے کے ساتھ حاصل کئے تھے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ درمیانے مگر ورزشی جسم والا نوجوان تھا اور کئی معرکے مار چکا تھا۔ اسے کمانڈو ایکشن کا کافی تجربہ تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اردو اور پنجابی کشمیری لہجے کے بغیر بول لیتا تھا۔ یوں اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ کوئی نوجوان کشمیری ہے۔ رنگ اس کا میری طرح صاف ضرور تھا۔ مگر یہ کوئی تشویش والی بات نہیں تھی۔

ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ سے منہ اندھیرے روانہ ہوئے۔

خاص پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم جس وقت شہر سے کافی آگے کی جانب جموں بانہال جانے والی سڑک پر آئے تو دن نکل چکا تھا۔ ہم اپنی شکل صورت اور لباس سے دفتر میں کام کرنے والے بابو لگتے تھے۔ سری نگر شہر کے بڑے پل پر چیکنگ کا خطرہ تھا۔ وہاں سے ہم آگے نکل آئے تھے۔ اب خطرہ جموں شہر میں داخل ہوتے وقت تھا۔ مگر وہاں بھی چیکنگ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سی آئی ڈی والے ضرور ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ باہر سے آتے وقت لاری اڈے اور ریلوے سٹیشن پر مشکوک افراد کی اسی وقت تلاشی لے لی جاتی تھی۔ مگر جموں سے نکلتے ہوئے اتنی سختی نہیں ہوتی تھی۔

سری نگر کی طرف سے ایک لاری آئی۔

ہم نے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ معلوم ہوا لاری صرف بانہال تک جائے گی۔ ہم بیٹھ گئے کہ بانہال میں رات گزاریں گے اور وہاں سے صبح کے وقت جموں کی لاری پکڑ لیں گے۔ لاری نے ہمیں بانہال پہنچا دیا۔ یہاں تک بالکل خیریت رہی۔ رات ہم نے لاری اڈے کے ایک ہوٹل کی کوٹھڑی میں بسر کی۔ یہاں سردی زیادہ تھی۔ صبح صبح جموں والی لاری میں سوار ہو گئے۔ جموں قریب آنے لگا تو ہم محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم الگ الگ

سیٹوں پر فاصلہ ڈال کر بیٹھے تھے اور راستے میں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ لاری جموں کے اڈے پر پہنچ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے کمانڈو منصور احمد ڈار کو ہوشیار رہنے کے لئے کہا۔ کیونکہ مجھے وہاں ایک مشکوک صورت آدمی نظر آگیا تھا جو یقیناً سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ ہم لاری میں سے اتر کر الگ الگ ہو کر اڈے سے نکل پڑے۔ یہ ہم نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ ہمیں اڈے سے نکل کر کہاں جانا ہے۔

کمانڈو منصور پہلے گیا۔ اس کے پیچھے تھوڑا فاصلہ ڈال کر میں بھی چل پڑا۔ چوک آیا تو یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے پیچھے کوئی سی آئی ڈی والا لگا ہے یا نہیں میں سگریٹ پان والی دکان پر رک گیا۔ میں نے سگریٹ خریدنے کے بہانے پیچھے نگاہ ڈالی۔ شام ہو رہی تھی۔ بازار میں لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ مجھے سی آئی ڈی والے کی شکل کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اسے مجھ پر شک شبہ نہیں ہوا تھا۔ جو بازار ریلوے سٹیشن کی طرف جاتا تھا اس کے شروع میں ایک ہوٹل تھا جس کا نام شاید شردھا نند ہوٹل تھا۔ ہم نے یہیں آکر ملنے کا طے کیا ہوا تھا۔ میں ہوٹل کے اندر داخل ہوا تو کونے میں کمانڈر منصور احمد ڈار بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ امرتسر جانے والی گاڑی شام کے سوا سات بجے جموں سے روانہ ہونے والی تھی۔ ابھی کافی وقت تھا۔ ہم وہیں ہوٹل میں کونے والی میز کے پاس بیٹھے رہے۔ ہم نے وہیں کھانا منگوا کر کھایا۔ پھر چائے منگوالی اور آہستہ آہستہ پیتے اور وقت گزارتے رہے۔

جموں توی کا سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پندرہ منٹ پہلے سٹیشن پر آ گئے۔ کمانڈر منصور احمد بٹ جا کر دو ٹکٹ لے آیا۔ ٹرین اتنے میں پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ مسافر سوار ہونے لگے۔ ہم بھی ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی موجود تھے مگر کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ مسافروں کا رش بھی کافی تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ راستے میں اس کا انجن خراب ہو گیا۔ وہاں اس نے کافی دیر لگا دی۔ جالندھر پہنچتے پہنچتے کافی رات ہو گئی۔ جالندھر ریلوے سٹیشن پر سکھ پولیس کافی تعداد میں موجود تھی۔ میں نے کمانڈر منصور احمد بٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر بڑی

جلدی ہمیں معلوم ہو گیا کہ پولیس کی گارڈ جالندھر سے انبالے جا رہی ہے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی جالندھر سٹیشن پر کافی دیر تک رکی رہی۔ ہم اپنے ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ پولیس کی پارٹی کو امرتسر سے دلی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ چنانچہ سکھ سپاہی بیزاری کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کچھ ٹی سٹال کے پاس بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آخر ٹرین نے وسل دیا اور امرتسر کی طرف کھسکنے لگی۔ جالندھر سے امرتسر کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ٹرین کی رفتار سست تھی۔ اس نے دو گھنٹوں میں ہمیں امرتسر پہنچایا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ امرتسر سٹیشن پر بھی پولیس موجود تھی مگر تین چار سپاہی ہی تھے جو دور کھڑے مسافروں کو ٹرین سے اترتے دیکھ رہے تھے۔ ہم یہاں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر سٹیشن سے باہر نکلے۔ ہم دونوں کو امرتسر میں مقیم اپنے مجاہد کے مکان کا پتہ معلوم تھا۔ خطرہ ہمیں صرف اس بات کا تھا کہ ہمارے پاس پستول تھے۔ مگر ہم خیریت سے سٹیشن کی حدود سے نکل گئے۔ واہگہ بارڈر کو جانے والی سڑک سردی کی وجہ سے سنسان پڑی تھی۔ میں گرمی کے موسم میں ایک بار رات کو یہاں سے گزرا تھا تو دکانوں کے آگے چارپائیوں پر لوگ سو رہے تھے۔ اب وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی ہم ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ ڈال کر آگے پیچھے ہو گئے تھے۔ میں آگے آگے چل رہا تھا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ میرے پیچھے کوئی دس بارہ قدم کے فاصلے پر سڑک کی ایک طرف ہو کر آ رہا تھا۔

دائم گنج کی آبادی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی تو قریب بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب کھیتوں میں ہو گیا۔ کمانڈو منصور بھی میرے پیچھے پیچھے کھیتوں میں آ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا مگر پولیس کے کسی سپاہی کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ اس علاقے میں رات کو پولیس ضرور گشت پر ہوتی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ آگے چھاؤنی تھی۔ دائم گنج کے مکانوں کی روشنی دور سے نظر آ رہی تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ہم اپنے مجاہد کے مکان پر آ گئے۔ دروازہ اندر سے بند

تھا۔ میں نے آہستہ سے مخصوص دستک دی۔ دوسری بار دستک دینے پر اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور اپنے مجاہد نے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟"

حالانکہ وہ میرے دستک دینے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ کوئی حریت پرست مجاہد ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے اوپر منہ کر کے کہا۔

"مہاراج! پٹیالے سے آپ کے تایا جی آئے ہیں۔"

یہ میں نے اس لئے بلند آواز میں کہا تھا کہ اگر آس پاس کے گھروں میں کوئی سن رہا ہو تو اسے شک نہ پڑ جائے کہ آدھی رات کو کون ملنے آیا ہے۔ مجاہد نے نیچے آکر دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ سے اور مجھ سے وہ بغل گیر ہو کر ملا اور پہلا سوال اس نے یہ کیا۔

"تمہارے پیچھے کوئی سی آئی ڈی والا تو نہیں لگا ہوا تھا؟"

میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے"

مجاہد کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے اس وقت تم لوگ آرام کرو کل صبح بات ہو گی۔"

بیٹھک میں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ مجاہد اوپر سے دو لحاف لے آیا۔ ہم وہاں لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ اگلے روز دن چڑھے اٹھے۔ مجاہد کہنے لگا۔

"میں کام پر جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کا ناشتہ کچن میں تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ جب تک میں نہ آؤں مکان سے باہر مت جانا"

وہ چلا گیا۔ ہم نے کچن میں جا کر چولہے کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیا اور واپس بیٹھک میں آکر لحاف گھٹنوں تک اوڑھ کر دری پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ کمانڈر شیروان اگر امرتسر جیل میں ہے تو کونسی پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہے کیونکہ امرتسر جیل کافی بڑی جیل ہے اور اس

کئی چکیاں ہوں گی"

میں نے کہا۔

"اپنا مجاہد یہ سب معلوم کر لے گا۔ اس نے سراغ رسانی کے لئے کچھ خاص آدمی رکھے ہوئے ہیں جو وادی کے کشمیری مسلمان ہی ہیں اور اس شہر میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔"

• ایک گھنٹے بعد مجاہد آگیا۔

وہ ہمارے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ یہاں کیسے آنا ہوا ہے؟"

جب ہم نے اسے بتایا کہ بھارتی فوج نے ہماری کیمپ گاہ پر حملہ کر کے کمانڈر شیروان کو گرفتار کر لیا ہے اور ہماری اطلاع کے مطابق اسے امرتسر جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے تو وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ہماری طرف چہرہ اٹھا کر بولا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔ کمانڈر شیروان کا پکڑا جانا ہماری تحریک آزادی کے لئے برا شگون ہے۔ لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔ اس وقت کشمیر کا بچہ بچہ کمانڈر شیروان ہے۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے کہا۔

"ہمارا خیال تھا کہ کمانڈر کو انڈین ملٹری انٹیلی جینس جموں کے انٹیروگیشن سنٹر میں لے گئی ہو گی۔ لیکن ہمیں اطلاع ملی کہ کمانڈر کو امرتسر جیل میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ تحریک آزادی کشمیر کی بڑی اہم شخصیت ہے اور بھارتی فوج اور کشمیر کی ہندو پولیس ایک مدت سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی"

میں نے کہا۔

"ہم اپنے کمانڈر کو امرتسر جیل سے نکالنے آئے ہیں"

مجاہد نے سگریٹ سلگا لیا تھا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ منصور احمد بٹ نے کہا۔

"سب سے پہلے تو اس بات کی تصدیق ہونی چاہیے کہ کمانڈر شیروان امرتسر جیل

میں ہی ہے۔ اس کے بعد پھر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے جس پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کیا گیا ہے اس کا رخ جیل کی کس جانب ہے اور وہاں سے جیل کی بڑی دیوار کتنی دور ہے۔"

اپنے مجاہد نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ساری معلومات کل تک حاصل ہو جائیں گی۔"

وہ سارا دن ہم نے مجاہد کے مکان کے اندر رہ کر ہی گزار دیا۔ رات کو باری باری نکل کر کھیتوں میں تھوڑی دیر کے لئے ٹہلنے گئے اور پھر واپس مکان میں آگئے۔ رات کو اپنا مجاہد دکان بند کر کے آیا تو اس نے سب سے پہلا انکشاف یہ کیا کہ کمانڈر شیروان امرتسر جیل میں نہیں ہے۔ ہم اس کا منہ تکنے لگے۔

"تو پھر فوج اسے کون سے شہر میں لے گئی ہے؟"

کمانڈو منصور احمد بٹ کے اس سوال پر مجاہد نے ہمارے پاس اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر اسی شہر میں ہے۔ مگر امرتسر جیل میں نہیں ہے۔ اسے امرتسر چھاؤنی کے قلعے میں رکھا گیا ہے۔ مجھے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق کمانڈر شیروان پر شدید تشدد کیا جا رہا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی۔

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ کمانڈر بھارتی انٹیلی جنیس کی تحویل میں ہے"

مجاہد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ پنجاب کی خفیہ پولیس کی حراست میں ہے اور پنجاب پولیس ہی اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

"مگر امرتسر چھاؤنی کے قلعے میں تو فوج مقیم ہے"

کمانڈو منصور احمد بٹ کی اس بات کے جواب میں مجاہد نے کہا۔

"کسی زمانے میں یہاں قلعے میں رہا کرتی تھی مگر اب ایک عرصے سے یہ قلعہ پنجاب کی خفیہ پولیس کا ہیڈ کوارٹر بن چکا ہے۔ یہاں بڑے خطرناک مجرموں کو لایا جاتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ کرنے والے بے حد ظالم سنگدل اور تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان کبھی زبان نہیں کھولے گا لیکن یہ لوگ قلعے میں اس پر بہت تشدد کریں گے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تشدد سے کہیں کمانڈر شہید نہ ہو جائے۔"

مجاہد نے کہا۔

"اس بات کا امکان موجود ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے قلعے میں ہماری رپورٹ کے مطابق ایسے کئی مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا اور انہیں پنجاب پولیس نے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور وہ شہید ہو گئے۔"

میں نے مجاہد سے کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں جتنی جلدی ہو سکے کمانڈر شیروان کو قلعے سے نکالنا ہو گا۔ اس سلسلے میں تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

مجاہد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"صرف کمانڈر کو قلعے سے باہر نہیں نکال سکتا باقی تمہاری ہر قسم کی مدد کی کوشش کرنے کو تیار ہوں"

میں نے مجاہد سے کہا۔

"کیا کسی طرح ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کمانڈر کو قلعے میں کس جگہ پر رکھا گیا ہے اور جس جگہ پر رکھا گیا ہے اس کا رخ قلعے کی چار دیواری کی کس جانب ہے؟"

مجاہد نے آہستہ آہستہ سرہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ معلوم ہو جائے گا۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے سوال کیا۔

"کیا ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ قلعے کے اندر خفیہ پولیس کے دفاتر شام کو کس وقت بند ہو جاتے ہیں اور بند ہو جانے کے بعد وہاں کہاں کہاں پہرہ ہوتا ہے اور دفتروں کی صفائی کرنے والے خاکروب کس وقت قلعے میں داخل ہوتے ہیں کتنی دیر تک قلعے کے اندر جھاڑو وغیرہ دیتے رہتے ہیں؟"

مجاہد اسی طرح بے نیازی سے سگریٹ پیتے ہوئے آہستہ آہستہ سرہلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سب معلومات آپ کو مل جائیں گی مگر وقت لگے گا۔"

"زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے"

میں نے کہا۔ مجاہد بولا۔

"صرف آج اور کل کا دن دے دو۔ کل رات کو مجھے جس قدر معلومات مل سکیں تمہیں آکر بتا دوں گا۔"

وہ دن اور اس سے اگلا دن ہم نے اپنے مجاہد کے مکان کے اندر ہی بڑی بے چینی سے گزارا۔ دوسرے روز رات کو مجاہد دکان بند کرنے کے بعد سیدھا گھر پر آگیا۔ ہم بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مجاہد ہمیں اوپر والی منزل کی بیٹھک میں لے گیا۔ وہاں ہمارے سامنے زمین پر بچھی ہوئی جازم پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان کو قلعے کے اندر زمین دوز تہہ خانے میں رکھا گیا ہے۔ اس کا رخ قلعے کی مشرقی جانب ہے۔ یعنی جس طرف ریلوے کا رگیو برج ہے۔ تہہ خانے سے باہر قلعے کی پرانی سیڑھیاں ہیں جو اوپر قلعے کی چھت کو جاتی ہیں۔ قلعے کے اس رخ سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ قلعے کے اس رخ پر قلعے کی چھت پر ایک مورچہ سا بنا ہوا ہے۔ یہ سیمنٹ کا مورچہ ہے اور اس میں تین چار چوڑے سوراخ ہیں۔ جب فوج قلعے میں رہتی تھی تو یہاں مشین گن پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب یہ مورچہ بالکل خالی پڑا ہے۔"

میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"رات کو قلعے کی چھت پر پولیس کے کتنے سپاہی پہرے پر ہوتے ہیں؟"

مجاہد نے جواب دیا۔

"مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق قلعے کی چھت پر رات کو کوئی سپاہی پہرے پر نہیں ہوتا۔ مگر جس تہہ خانے میں کمانڈر قید ہے اس کے دروازے پر ہر وقت ایک مسلح سپاہی موجود ہوتا ہے۔ ہر چار گھنٹے کے بعد اس کی جگہ نیا سپاہی پہرے پر آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ قلعے کے اندر دفتر پانچ بجے شام کو بند ہو جاتے ہیں۔ سٹاف اپنے اپنے گھروں کو چلا جاتا ہے۔ لیکن پولیس وہاں جگہ جگہ پہرے پر موجود ہوتی ہے۔ ایک دو خفیہ پولیس کے افسر بھی رات کی ڈیوٹی پر ضرور رہتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے کمانڈر شیروان سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ قلعے کے اندر دو چھوٹی سڑکیں جو خفیہ پولیس کے دفاتر کے آگے سے ہوتی ہوئی ایک دوسرے کو کاٹتی شمالاً جنوباً قلعے کی دیوار تک چلی جاتی ہیں۔ ان پر جھاڑو دینے والا عملہ صبح منہ اندھیرے آجاتا ہے اور دفتر کھلنے سے پہلے واپس چلا جاتا ہے۔ دفتروں کی جھاڑ پونچھ چپڑاسی کرتے ہیں۔"

اپنے مجاہد نے ہمیں قلعے کے اندر کی جس قدر تفصیل بتا دی تھی مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ ایک طرح سے قلعے کے اندر کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"قلعے کے دروازے کی کیا صورت حال ہے؟ میرا مطلب ہے رات کے وقت کیا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے؟"

مجاہد نے کہا۔

"دروازہ لوہے کا ہے۔ وہ شام ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا دروازہ ہے۔ وہ کھلا رہتا ہے۔ اس کو تالا نہیں لگایا جاتا۔ دروازے کے اندر باہر دونوں جانب مسلح پولیس کے دو دو سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹیاں بھی چار چار گھنٹے کے بعد بدل جاتی ہیں اور پہلے سپاہیوں کی جگہ دوسرے سپاہی آجاتے ہیں۔ دن کے وقت بھی بغیر شناختی کارڈ دکھائے کوئی دفتر کا آدمی بھی قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

اپنے مجاہد نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اب ہمارا کام شروع ہونا تھا۔ میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ اپنے مجاہد کی فراہم کی ہوئی معلومات کی روشنی میں کمانڈر شیروان تک قلعے کے اندر پہنچنے اور وہاں سے اسے باہر نکالنے کی منصوبہ بندی پر کافی دیر تک غور و فکر کرتے رہے۔ ہمارے پاس دو آٹو میٹک پستول تھے۔ ہمیں اس پر لگانے کے لئے سائی لینسروں کی اشد ضرورت تھی۔ قلعے کے اندر پہنچ جانے کی صورت میں اگر کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے تو ہم ایسا فائر نہیں کر سکتے تھے جس کا دھماکہ پیدا ہو۔ یہ دھماکہ قلعے میں پولیس کی ساری نفری کو بیدار کر کے ہمارا منصوبہ خاک میں ملا سکتا تھا۔ ہم نے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ کمانڈو منصور احمد ڈار نے کہا۔

"کیا اپنا مجاہد پستولوں کے لئے سائی لینسر مہیا کر سکے گا؟"

میں نے کہا۔

"یہ تو صبح اس سے بات کرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔"

اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح اٹھے تو دن کے نو بج رہے تھے اور مجاہد خود ناشتہ کر چکا تھا اور ہمارے لئے ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ مجاہد دکان پر جانے کے لئے تیار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم سے دو چار ضروری باتیں کرنی ہیں۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس بیٹھ سکو گے؟"

وہ ہمارے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔

"کیوں نہیں۔ بتاؤ کیا بات ہے"

میں نے اسے اپنا سارا منصوبہ بتا دیا اور کہا۔

"ہمیں دو جوڑے ایسے کپڑوں کے چاہئیں جس قسم کے کپڑے یہاں کے ہندو مزدور عام طور پر پہنتے ہیں۔ مگر سب سے ضروری چیز جو ہمیں درکار ہے وہ ہمارے آٹو میٹک پستولوں کے لئے دو سائی لینسر ہیں۔ کیا تم ہمارے پستولوں پر فٹ آجانے والے دو سائی لینسر پیدا کر سکو گے؟"

مجاہد نے اپنی مخصوص بے نیازی سے جواب دیا۔

"مجھے دونوں پستول خالی کر کے دے دو۔ میں کوشش کروں گا۔"

میں نے اسی وقت دونوں پستولوں کے میگزین نکالے اور انہیں مجاہد کے حوالے کر دیا۔ اس نے دونوں پستول اپنی قمیض کے اندر چھپا لئے اور بولا۔

"دروازے کو اندر سے اچھی طرح بند کر لینا اور باہر بالکل نہ نکلنا"

وہ چلا گیا۔ وہ ہمیں رات کے وقت بھی مکان سے نکلنے کی بڑی مشکل سے اجازت دیتا تھا۔ یہ بات ضروری بھی تھی۔ اس لئے کہ ہم بڑے اہم مشن پر آئے ہوئے تھے اور اس مشن کے لئے ضروری تھا کہ ہم لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں۔ وہ دوپہر کو کھانا کھانے بھی نہ آیا۔ ہم دونوں نے رات کا بنا ہوا کھانا کھا لیا۔ وہ رات کو آیا۔ کہنے لگا۔

"مجھے شہر سے دور ایک گاؤں میں جانا پڑ گیا تھا۔ جس آدمی کے پاس تمہارے پستولوں کے سائز کے سائی لینسر تھے وہ بارڈر کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے۔"

اس نے قمیض کے اندر سے دونوں پستول نکال کر ہمارے حوالے کئے۔ دونوں کی نالیوں پر سائی لینسر چڑھے ہوئے تھے۔

"اپنی تسلی کر کے دیکھ لو۔ اگر انیس بیس کا فرق ہے تو یہ تبدیل بھی کئے جا سکتے ہیں"

میں نے سائی لینسر کو کھول کر دوبارہ لگایا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے بھی اپنے پستول کے سائی لینسر کو کھول کر دوبارہ فٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ بالکل صحیح ہیں"

"ہاں"

میں نے کہا۔

مجاہد کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ صبح بتا دینا صبح تمہارے لئے پرانے کپڑے بھی لے آؤں گا"

میں نے کہا۔

"ہمیں دو زمین کھودنے والی کھرپیاں اور ایک پیائش کرنے والا فیتہ بھی چاہئے"

مجاہد نے کچن میں سے جواب دیا۔

"صبح یہ دونوں چیزیں تمہیں مل جائیں گی"

دوسرے دن وہ نو بجے گھر سے نکل گیا اور گیارہ بجے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پٹ سن کا تھیلا تھا۔ تھیلے میں ہمارے لئے ہندو پہناوے کے دو پرانے گرم کوٹ اور دو میلی سی پگڑیاں تھیں جنہیں پنجاب کے ہندو مالی باغبان سر پر باندھا کرتے ہیں۔ سارا منصوبہ ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے تیاری شروع کر دی۔ جب ہم نے پاجامے کرتے پہن کر سروں پر الٹی سیدھی پگڑیاں باندھیں تو مجاہد ہنس کر بولا۔

"تم دونوں کسی سرکاری دفتر کے باغیچے کے مالی لگتے ہو"

میں نے کہا۔

"بس میں یہی چاہتا تھا۔ اب تم ایسا کرو کہ ہمارے ماتھوں پر سرخ پنسل یا سرخ

روشنائی سے ہندوؤں والے تلک لگا دو"

اس کے پاس نہ سرخ روشنائی تھی نہ سرخ پنسل تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ ہندو سکھوں کا شہر ہے۔ میں بازار سے ابھی تلک لگانے والا بنا بنایا رنگ لے آتا ہوں۔"

وہ دائم گنج کی دکان سے ایک چھوٹی سی ڈبی خرید کر لے آیا جس میں سرخ رنگ گھلا ہوا تھا۔ اس نے میرے اور کمانڈر منصور احمد بٹ کے ماتھوں پر ابروؤں کے درمیان جس طرح ہندو تلک لگاتے ہیں دو تلک لگا دیئے۔ اب ہم پورے ہندو لگنے لگے تھے۔ ہم نے کھرپیاں ہاتھوں میں پکڑ لیں اور خاموشی سے مکان سے نکل کر گلی میں سے ہوتے ہوئے پیچھے کھیتوں میں آکر ریگو برج کی طرف چل پڑے۔ کیونکہ میں اس سارے علاقے سے واقف تھا اس لئے میں ذرا آگے آگے چل رہا تھا۔ ہمیں وہاں جا کر جو کچھ کرنا تھا وہ مجھے بھی معلوم تھا اور منصور احمد بٹ کمانڈو کو بھی معلوم تھا۔

ریگو برج والی سڑک کو پار کر کے ہم بائیں جانب قلعے کی پریڈ میں داخل ہو گئے۔ قلعے کا یہ میدان جیسا میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا اس طرح سنگلاخ اور ریتلا تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ بدرو کی جانب کھوکھوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی جہاں نئی میوہ منڈی بن گئی ہوئی تھی۔ قلعے کی اونچی اور قدیم دیوار والی عمارت قریب آ رہی تھی۔ ہم قلعے کی دیوار کی مشرق کی سمت آ گئے۔ ہم ہاتھوں میں کھرپے لئے بڑے مزے مزے سے چل رہے تھے۔ کوئی دیکھتا تو یہی لگتا کہ ہم کمیٹی کے مالی ہیں۔ قلعے کی مشرقی جانب والی دیوار سے کوئی تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر آکر ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے سگریٹ سلگا لئے اور سگریٹ پیتے ہوئے قلعے کی دیوار کی چھت کی طرف دیکھا قلعے کی دیوار ساٹھ ستر فٹ اونچی ہو گی۔ اوپر ایک سیمنٹ اور اینٹوں سے بنا ہوا چھجہ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کے نیچے دیوار میں چار چوکور سوراخ بنے ہوئے تھے۔

میں نے وہ سوراخ کمانڈو منصور احمد بٹ کو دکھایا اور کہا۔

"یہیں وہ مورچہ ہے جہاں فوج کے زمانے میں مشین گن کی پوسٹ ہوا کرتی تھی۔

اب اٹھ کر اپنا کام بھی ساتھ ساتھ شروع کرتے ہیں تاکہ اگر قلعے کی جانب سے ہمیں کوئی دیکھ رہا ہو تو اسے ہم پر شک نہ ہو"

میں نے جیب سے پیائش کرنے والا فیتہ نکال کر اس کا ایک سرا کمانڈو منصور کو پکڑایا اور خود یہ فیتہ کھول کر کوئی دس فٹ کے فاصلے پر زمین پر کھرپی سے نشان لگا دیا اس طرح ہم نشان لگاتے لگاتے قلعے کی دیوار کے مزید قریب ہوتے چلے گئے۔ دس جگہوں پر نشان لگانے کے بعد ہم نے اپنے لگائے ہوئے نشانوں کی جگہوں پر کھرپی سے زمین میں سوراخ ڈالنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ ہم دیوار کی اونچائی اور اس کے اوپر چھجے کے اندر بنے ہوئے سوراخوں کا بھی جائزہ لے رہے تھے۔

کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"جگہ تو یہی ہے۔ اور اسی مورچے کے قریب چھت پر سے نیچے زینہ دوسری منزل پر اس تہہ خانے کے دروازے کے قریب جاتا ہے جہاں کمانڈر شیروان قید ہے۔ مگر اس دیوار پر چڑھا کیسے جائے گا؟"

میں نے کہا۔

"اگر ہم اس دیوار پر نہیں چڑھ سکتے تو پھر کمانڈو کی تربیت ہم نے کس لئے لی تھی۔ ہم میں اور ایک ٹرینڈ کمانڈو میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے"

اس وقت پستول ہمارے پاس نہیں تھے۔ پستولوں کی ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم دونوں پستول اپنے مجاہد کے مکان پر ہی چھوڑ آئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھے زمین میں کھرپی سے سوراخ ڈال رہے تھے۔ یہ کام ہم بڑے آرام سے کر رہے تھے۔ ہماری ساری توجہ قلعے کی دیوار کی طرف تھی۔ میں بڑے غور سے دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ قلعے کی دیوار کے نیچے ایک کھائی تھی جس میں جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا اور کہیں کہیں کوڑے کا ڈھیر بھی لگا ہوا دور سے نظر آ رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس دیوار کو پھلانگنے اور اوپر مورچے کے چھجے تک پہنچنے کے لئے ہمیں کم از کم ستر فٹ لمبے رسے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ ذرا مشکل کام تھا۔

مشکل ان معنوں میں کہ ہمیں ستر فٹ لمبا رسا اٹھا کر یہاں تک لانا تھا اور پھر رسے کے آگے آنکڑا لگا کر اسے مورچے کے سوراخ کی جانب ستر فٹ سے زیادہ اوپر کی طرف اچھالنا تھا جو اس سے زیادہ مشکل کام تھا۔ ابھی ہم نے تین سوراخ ہی کھودے تھے کہ ایک طرف سے ہمیں پولیس کا سپاہی ہماری طرف آتا نظر پڑا۔ میں نے کمانڈو منصور بٹ کو ہوشیار کر دیا۔ ہم خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ سپاہی سکھ تھا۔ وہ ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور بڑے رعب سے بولا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟"

میں کھرپے والا ہاتھ روک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سکھ سپاہی کو نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج ہم کمیٹی کے مالی ہیں۔ کمیٹی یہاں پریڈ کے کنارے کنارے نئے درخت لگا ی ہے۔ ہم کو سیکرٹری صاحب نے درختوں کے واسطے سوراخ بنانے کو بھیجا ہے کل اس ا ڈی سی صاحب آکر درخت لگائیں گے جی۔"

سکھ سپاہی جھک کر ہمارے بنائے ہوئے سوراخوں کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اپنا کام ختم کر کے پل کی طرف سے چلے جانا۔ پریڈ والے بٹ کی طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج۔ ہم آئے بھی اسی طرف سے ہیں سرکار"

"بس بس کام کرو اور یہ تم سگریٹ کیوں پی رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے سگریٹ زمین پر پھینک دیا اور کہا۔

"غلطی ہو گئی مہاراج۔"

سکھ سپاہی بڑبڑاتا ہوا۔ شاید ہم دونوں کو دل میں گالیاں دیتا جدھر سے آیا تھا اسی رف چلا گیا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"مصیبت آئی تھی ٹل گئی"

میں نے کھرپی چلاتے ہوئے کہا۔

"منصور ابھی اس سے بھی بڑی بڑی مصیبتیں آئیں گی۔"

اتنی دیر میں قلعے کی دیوار کی اونچائی اور اس کی اوپر سے نیچے تک ہموار سطح کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم رسے کی مدد سے اس دیوار کے اوپر نہیں چڑھ سکتے اور اس کے لئے ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ دوسرا راستہ یہی تھا کہ قلعے کے اندر جا کر چھت پر سے رسہ نیچے لٹکا دیا جائے۔ یہ کام دشوار اور بظاہر ناممکن لگتا تھا۔ لیکن کمانڈو اگر کسی مشن کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ ناممکن ہے تو اسے کمانڈو کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فوراً میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے یہ ترکیب کمانڈو منصور کو بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"دیکھ لو۔ کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟ یہ مجھے مشکل بات نظر آتی ہے"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ یہ کام میں مکمل کروں گا۔ آؤ اب واپس چلتے ہیں۔ اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

ہم اسی طرح کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے الگ الگ ہو کر اپنے مجاہد کے مکان میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ دوپہر کو آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہماری کارگزاری معلوم کرنے دوپہر کو کھانے کے وقت آئے گا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"دوست! نیچے سے قلعے کی دیوار پر اوپر مورچے کی چھت تک چڑھنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم چھت کے اوپر سے رسہ نیچے لٹکانے کی کوشش کریں۔"

مجاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب تم لوگ قلعے کی چھت پر پہنچ ہی جاؤ گے تو پھر اوپر سے رسہ لٹکانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہمیں اپنے کمانڈر کو بھی تو قلعے سے باہر نکالنا ہے اور اس کو قلعے سے باہر نکالنے کے لئے سب سے آسان راستہ یہی ہے۔ کیونکہ ہم اسے لے کر قلعے کے آہنی گیٹ سے نہیں نکل سکیں گے"

اس نے پوچھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم لوگ قلعے کے اندر کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"یہی سوچنا ہے۔ تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ ہم میں سے جو کوئی بھی قلعے کے اندر جائے گا اسے اپنے ساتھ کم از کم ستر فٹ لمبی رسی لے جانی ہو گی جو ہم قمیض کے اندر نہیں چھپا سکیں گے۔"

میں نے ایک طریقہ سوچ رکھا تھا مگر میں مجاہد کی رائے بھی لینا چاہتا تھا کہ دیکھیں وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں مجھ سے کوئی بہتر ترکیب ہو۔ مگر اپنے مجاہد اور کمانڈو منصور احمد بٹ کے ذہن میں بھی کوئی قابل عمل ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ تب میں نے انہیں اپنی ترکیب بتاتے ہوئے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ جو خاکروب قلعے کے اندر جھاڑو وغیرہ دیتے ہیں وہ صبح منہ اندھیرے آتے ہیں۔"

"ہاں"

مجاہد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کمانڈو منصور احمد بٹ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کے سوائے اور کوئی ترکیب قلعے کے اندر جانے کی نہیں ہو سکتی کہ ہم دونوں یعنی میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ خاکروبوں کا بھیس بنا کر منہ اندھیرے قلعے کے اندر جائیں۔ ظاہر ہے جو خاکروب صفائی وغیرہ کرنے آتے ہیں ان کے ساتھ کوئی چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی ہو گی ہم اس ریڑھی میں رسی چھپا کر اندر لے جا سکتے ہیں۔"

مجاہد نے کہا۔

"لیکن جو خاکروب روزانہ قلعے کے اندر صفائی کرنے آتے ہیں ان کو تو قلعے کے گارڈ پہچانتے ہیں اور ان کے پاس شناختی کارڈ بھی ہوتے ہیں۔ تم کیسے ان کی جگہ اندر داخل ہو سکو گے؟ تم تو وہیں پکڑ لئے جاؤ گے"

میں نے کہا۔

"ہمیں ان دونوں صفائی کرنے والوں کو راستے میں ہی کسی جگہ غائب کرنا ہو گا اور ان کے کپڑے پہن کر ان کی جگہ قلعے میں داخل ہونا ہو گا گارڈ ڈیوٹی والے سنتری نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ وہ دونوں دوسرے گاؤں شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ ہم صفائی کرنے آئے ہیں۔ بہرحال یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔ اول تو کوئی سنتری اس بارے میں تفتیش نہیں شروع کرے گا کہ ہم ان کی جگہ پر کیوں آئے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیدا ہو بھی گئی تو پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم پستول ساتھ لے کر جائیں گے۔"

مجاہد کو ہمارے اس منصوبے کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ایک بات ابھی سے یاد کر لو کہ اگر کوئی ایمرجنسی والی صورت پیدا ہو گئی اور تم پکڑے گئے تو اپنی زبانیں بند رکھنا۔"

میں نے کہا۔

"دوست! یہ بات تمہیں کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ تو ہم مجاہدوں کا پہلا اصول ہے کہ مر جائیں گے مگر زبان نہیں کھولیں گے۔ اب تم ہمیں صرف یہ معلوم کر کے بتا دو کہ قلعے میں جو خاکروب منہ اندھیرے صفائی کے لئے آتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور گھر سے قلعے تک ان کا راستہ کون سا ہے۔ باقی ہم جانیں ہمارا کام"

مجاہد نے وعدہ کیا وہ آج شام کو یہ بھی پتہ کرا دے گا۔ ہمارا مجاہد چلا گیا۔ رات کے پہلے پہر میں آیا۔ اور بولا۔

"تم میں سے ایک میرے ساتھ چلے"

میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے دائم گنج کی آبادی سے تھوڑے فاصلے پر مصلیوں کی

بستی کے پاس لے گیا۔ کہنے لگا۔

"اس بستی کے ایک مکان میں سے منہ اندھیرے دو خاکروب بوٹا مسیح اور منشی مسیح ڑھی لے کر نکلتے ہیں۔ ان کی ریڑھی کے آگے گدھا جتا ہوا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کس راستے سے ہو کر قلعے میں جاتے ہیں۔"

مصلیوں کی اس بستی سے ایک کچی سڑک نکل کر کھیتوں میں سے ہو کر قلعے کی طرف تی تھی۔ یہ چھوٹی سی سڑک تھی اور قلعے تک تین چار موڑ مڑتی تھی۔ قلعہ وہاں سے ہ سے زیادہ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہم واپس آگئے۔ مکان پر میں نے کمانڈو ر احمد بٹ کو سب کچھ سمجھا دیا۔ ہم جلدی سو گئے۔ رات کے تین بجے گھڑی کے م نے ہمیں جگا دیا۔ ہمارا لباس وہی عام ہندو مالیوں والا تھا۔ ماتھے پر سرخ تلک بھی ہم رہنے دیا تھا۔ موقع دیکھنے کے بعد میں نے اپنے مجاہد کی مدد سے ستر فٹ لمبی ایک پتلی بڑی مضبوط رسی منگوا کر رکھ لی تھی۔ رسی میں کہیں کہیں ہم نے گانٹھیں ڈال دی ں۔ رسی ہم نے سیاہ رنگ کی منگوائی تھی تاکہ دن کے وقت وہ قلعے کی عقبی دیوار کے تھ لٹک رہی ہو تو اس کا رنگ دیوار کے میلے رنگ میں گھل مل جائے اور دور سے نظر آئے۔ اس سے زیادہ احتیاط ہمارے اختیار میں نہیں تھی۔ ہم نے اٹھتے ہی اپنے اپنے ٹک پستول اور ان کا میگزین چیک کیا۔ رسی کا گول گچھا بنا کر میں نے اپنے کاندھے پر ل لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔

رات کے تین بجے ساری آبادی گہری نیند سو رہی تھی۔ ہم خالی اندھیری گلیوں میں ہو کر جلدی سے کھیتوں میں آگئے۔ یہاں ہم محفوظ تھے۔ جس راستے سے مجاہد مجھے کر مصلیوں کی بستی کی طرف گیا تھا۔ ہم اسی راستے سے چلتے بستی کے باہر آکر رک ۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

"ہمیں ایک جگہ چھپ کر دونوں خاکروبوں کا انتظار کرنا ہو گا۔"

کچی سڑک کے تیسرے موڑ پر ٹاہلی کے اونچے اونچے درخت ساتھ ساتھ کھڑے ۔ ہم اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں سڑک کی ایک طرف اور کمانڈو منصور احمد

بٹ دوسری طرف اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

"خبردار ہو جاؤ۔ دونوں آرہے ہیں"

یہ گھنگھرو ریڑھی کے آگے جتے ہوئے گدھے کی گردن میں بندھے ہوئے تھے۔ ستاروں کی ہلکی نیلی روشنی میں ہمیں بستی کی طرف سے ایک ریڑھی آتی نظر آئی۔ ذرا قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ دونوں خاکروب ریڑھی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا جس کے گل کی چمک دور سے دکھائی دی۔ جب ریڑھی ہمارے سامنے سے گزرنے لگی تو ہم پستولیں نکال کر سامنے آگئے۔ ہم نے جو میلی کچیلی پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں ان میں اپنا چہرہ بھی چھپالیا ہوا تھا۔ میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

"دونوں ریڑھی سے نیچے اتر آؤ۔ خبردار اگر کوئی حرکت کی تو ہمارے پستولوں کی گولیاں تم دونوں کو اڑا دیں گی۔"

دونوں خاکروب جن میں ایک بوڑھا تھا ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈر کر ریڑھی سے نیچے اتر آئے۔ ہم نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لئے رسی کے کچھ ٹکڑے کاٹ کر پہلے ہی سے الگ رکھ لئے تھے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ ان کے سامنے پستول نکالے کھڑا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کے ہاتھ رسی سے کس کر پیچھے باندھ دیئے۔ ان بے چاروں کی خوف کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ان میں جو ذرا نوجوان مگر دبلا پتلا تھا بڑی مشکل سے بولا۔

"ماراج ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے ہم تو چوڑھے ہیں۔"

بوڑھے نے عاجزی سے کہا۔

"ماراج ہماری گاڑی لے جائیں ہمیں نہ ماریں۔"

میں نے دونوں کے منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیئے اور انہیں کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا جہاں ایک گڑھا تھا۔ یہ گڑھا میں نے شام کو ہی دیکھ لیا ہوا تھا۔ اس میں درختوں کی شاخیں اور بڑے بڑے مڈھ پڑے تھے۔ ہم نے دونوں کے منہ کے آگے کپڑ

ر اتنی زور سے کپڑا باندھا کہ وہ ذرا سا بھی منہ نہ ہلا سکتے تھے۔ صرف سانس لے سکتے ے۔ پھر انہیں درختوں کے دو الگ الگ مڈھوں کے ساتھ لٹا کر اس طرح جکڑ دیا کہ وہ رف اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے پنجے ہی ہلا سکتے تھے۔ یہ کام ہم نے دو منٹ کے اندر اندر ر لیا۔ میں نے ان دونوں کے اوپر وہاں پڑی ہوئی درختوں کی سوکھی شاخیں ڈال دیں۔ ب وہ گڑھے میں پڑے ہوئے باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد ہم ریڑھی یا دھا گاڑی پر بیٹھ گئے اور گاڑی کو قلعے کی طرف ڈال دیا۔

گاڑی میں دو لمبے لمبے جھاڑو پڑے تھے۔ دو ٹوکرے تھے جن میں وہ قلعے کا کوڑا رکٹ ڈال کر باہر لاتے ہوں گے۔ کچھ فاصلے پر قلعے کے دروازے کی روشنی نظر آرہی ی۔ ہم گدھا گاڑی تیز تیز چلا رہے تھے۔ رات اندھیری تھی اور اس کے سکوت کو ے گدھے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی آواز ہی توڑ رہی تھی۔ کمانڈو منصور بٹ کہنے لگا۔

"ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے"

"کیا؟"

میں نے پوچھا۔

گدھا گاڑی کی باگیں میرے ہاتھ میں تھیں۔ کمانڈو منصور احمد بٹ بولا۔

"جن دو آدمیوں کو ہم باندھ کر پھینک آئے ہیں میرا نہیں خیال کہ وہ آج سارا دن ے وہاں پڑے رہیں اور ان کو کوئی نہ دیکھے یا وہ کوئی آواز نہ نکالیں۔ اس بات کا خطرہ ے کہ نوجوان مصلی دو تین گھنٹوں کی کوشش کے بعد آزاد ہو جائے گا اور وہ فوراً قلعے کی لیس کو جا کر ساری بات بتا دے گا۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ پولیس قلعے کی تلاشی لے اور اوپر چھت پر آکر نیچے لٹکی ہوئی رسی بھی دیکھ لے۔ اگر پولیس کو رسی نظر نہ بھی ی جب بھی وہاں کمانڈر شیروان والی کوٹھڑی کے اوپر پولیس کی نفری دوگنی کر دی جائے ی۔ یہ پولیس سی آئی ڈی کی ہے۔ اسے فوراً شک پڑ جائے گا کہ کشمیری کمانڈو خاکروبوں ے بھیس میں قلعے میں آئے تھے اور کمانڈر شیروان کو فرار کرانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست

کر گئے ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد ڈار کی بات کافی وزنی تھی۔ ہم نے آج قلعے کے باہر رسی لٹکانے کے بعد اسی دن آدھی رات کو وہاں آنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے پوچھا۔

"تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

وہ بولا۔

"دوست! ہمیں جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزرنا چاہئے۔ ابھی دن نکلنے میں کافی وقت ہے۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہم ابھی کمانڈو ایکشن کر کے کمانڈر شیروان کو نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آج کا سارا دن ان معلیوں کو دے دیا تو وہ گھنٹے دو گھنٹے کی جدو جہد کے بعد اس قابل ضرور ہو جائیں گے کہ رسیوں سے جکڑے ہوئے حلق سے آوازیں نکالنے لگیں اس طرح لوگ وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

مجھے کمانڈو منصور احمد بٹ کا مشورہ بہت صحیح معلوم ہوا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈو دوست! ٹھیک ہے۔ ہم اسی وقت کمانڈو ایکشن شروع کرتے ہیں۔"

ستر فٹ پتلی رسی کے گچھے کو ہم نے ٹوکری میں چھپا دیا تھا۔ ایک غلطی ہم سے ضرور ہوگئی تھی کہ ہم نے دونوں معلیوں کے شناختی کارڈ ان کی جیبوں سے نہیں نکالے تھے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں نے اس کا ذکر کمانڈو منصور احمد بٹ سے کیا تو وہ بولا۔

"اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ سیکورٹی گارڈ نے پوچھا تو کہہ دیں کہ ہمیں بوٹا اور منشی سے شناختی کارڈ لینے یاد نہیں رہے۔"

قلعے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے گدھا گاڑی روک لی۔ اس وقت قلعے کے آہنی گیٹ کا ایک بڑا پٹ آدھا کھلا ہوا تھا اور باہر دو سپاہی پہرے پر موجود تھے جن میں سے ایک سکھ تھا۔ میں اتر کر گدھے کو کھینچ کر قدم قدم چلاتا قلعے کے دروازے میں سے گزرنے لگا تو سکھ سپاہی نے بلب کی روشنی میں ہمیں دیکھ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ اوئے۔ تم کون ہو؟ وہ بوٹا اور منشی کہاں ہیں"

ہمارے حلیے اس وقت خاکروبوں والے ہی تھے۔ اوپر سے کمانڈو منصور احمد بٹ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی ہاتھ باندھ لئے اور بڑی عاجزی سے کہا۔

"ماراج! بوٹا اور منشی شادی بیاہ پر ساتھ والے گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی جگہ ڈیوٹی پر بھیجا ہے ماراج! میرا نام کندن مسیح ہے اور ماراج یہ میرا ماما ہے جی اس کا نام مرلی رام ہے جی۔"

دوسرا سپاہی بھی ہمارے قریب آگیا۔ کہنے لگا۔

"بوٹا اور منشی کب واپس آئیں گے؟"

میں نے ہاتھ باندھ کر بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

ماراج آج شام کو آجائیں گے جی۔ کل وہی ڈیوٹی پر آئیں گے۔ سرکار! قلعے کے اندر صفائی ستھرائی ضروری تھی۔ اس لئے ہم ان کی جگہ حاضر ہو گئے ہیں جی۔"

"چلو چلو اوئے۔ چلو اندر اور اسی طرح صفائی کرنا جس طرح بوٹا اور منشی کرتے ہیں۔"

میں نے ہاتھ باندھے ہوئے کہا۔

"ماراج آپ چنتا نہ کریں۔"

اور ہم گدھا گاڑی کو چلاتے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی پیدل چلتے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ٹوکری اٹھا کر نہیں دیکھی تھی۔ کیونکہ ٹوکری کے نیچے ستر فٹ لمبی رسی کا گچھا پڑا تھا۔ بہرحال اس کے جواز کے لئے بھی میں نے ایک معقول جواب ذہن میں سوچ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سپاہیوں نے گدھا گاڑی کے نیچے جو جھولا سا لٹکا ہوا تھا اسے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں ہمارے دونوں آٹومیٹک پستول اور میگزین تھے۔

چونکہ ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے اپنا کمانڈو آپریشن مکمل کر لینا تھا اس لئے بڑے تیز ایکشن کی ضرورت تھی۔ ہم ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ قلعے کے اندر ایک

پتلی سی سڑک تھی جس کی دونوں جانب سی آئی ڈی کے دفاتر تھے جو بند پڑے تھے۔ ہم گدھا گاڑی پر بیٹھ گئے اور اسے چلاتے سڑک کی مشرقی سمت چلے آئے۔ یہاں آکر ہم گدھا گاڑی سے اتر پڑے اور یونہی ادھر ادھر سڑک پر جھاڑو پھیرنے شروع کر دیئے۔ مشرق کی جانب قلعے کی پرانی سیڑھیاں اوپر والی منزل کو جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر بلب روشن تھا اس کی روشنی میں دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک سٹول پر بیٹھا تھا۔ رائفل اس نے گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھی۔ دوسرا سپاہی بڑی بیزاری سے رائفل کے سہارے کھڑا تھا۔ یہاں دیوار میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں جھاڑو دیتا کمانڈو منصور احمد بٹ کے قریب گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"یہی دروازہ نیچے کمانڈر شیروان کے تہہ خانے میں جاتا ہوگا"

ہم ذرا اندھیرے میں تھے۔ اس نے دروازے کو غور سے دیکھا اور بولا۔

"میرا خیال ہے یہی تہہ خانے کا دروازہ ہے مجاہد نے یہی بتایا تھا۔ مگر ہمیں پہلے کسی طرح تصدیق کر لینی چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"تصدیق کرنے کا وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمیں ایکشن شروع کر دینا چاہئے۔ آگے جو ہو سو ہو"

ہم نے گدھا گاڑی ایک طرف کھڑی کرتے ہوئے اس کے نیچے لٹکتے جھولے میں سے اپنے اپنے آٹومیٹک پستول نکال کر اپنے پرانے کوٹوں کے اندر چھپا لئے تھے۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

"میں ان دونوں سپاہیوں کو ٹھکانے لگانے جا رہا ہوں۔ جیسے ہی میں یہ کام ختم کروں تم ٹوکری کے نیچے سے رسی نکال کر سیڑھیوں میں آجانا۔ رسی سیڑھیوں میں چھپا کر مجھے کور دینا۔ اوکے؟"

زیادہ باتیں کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب ہمیں اشاروں میں اور زبان سے بڑی مختصر اور شارٹ ہینڈ ٹائپ کی گفتگو کرنی تھی۔ کمانڈو منصور وہیں سڑک کے کنارے جھاڑو

پھیرنے لگا۔ میں بھی جھاڑو پھیرتے ہوئے سپاہیوں کی طرف کھسکتا چلا گیا۔ ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"اوئے تم کون ہو؟ بوٹا مسیح کہاں ہے؟"

میں ہاتھ باندھ کر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"مارا ج! بوٹا اور منشی شادی پر گاؤں گئے ہوئے ہیں ان کی جگہ میں اور میرا بھائی مرلی آئے ہیں"

دوسرے سکھ نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر بجاؤ مرلی"

میں جھاڑو دیتا ہوا ان سپاہیوں کے تھوڑا پیچھے آگیا۔ پیچھے آتے ہی میں نے دائیں بائیں سڑک پر نگاہ ڈالی۔ وہاں اس وقت ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے جھکے جھکے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر آٹومیٹک پستول نکالا اور نکالنے کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے دونوں سپاہیوں کی پیٹھ پر تین تین فائر کر دیئے۔ سائی لینسروں کی وجہ سے پستول کے دھماکے نہیں ہوئے تھے۔ تین تین گولیاں کھاتے ہی دونوں سپاہی منہ کے بل گر پڑے۔ اس دوران کمانڈو منصور احمد بٹ رسی کا گچھا اٹھائے دوڑتا ہوا میرے پاس آگیا ہم نے دونوں سپاہیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک طرف اندھیرے میں ڈال دیا۔ میں نے کمانڈو منصور سے کہا۔

"سیڑھیوں میں چھپ جاؤ چوکس رہو۔ میں تہہ خانے میں جا رہا ہوں۔"

سیڑھیوں کے پاس ہی جو دروازہ تھا اس پر تالا پڑا ہوا تھا مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ یہ دروازہ تہہ خانے کو ہی جاتا ہے۔ اس میں اسلحہ کا ذخیرہ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اب اس قسم کی سوچ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے تالے پر فائر کیا۔ گولی نے تالے کو اڑا دیا۔ میں تھوڑا سا دروازہ کھول کر دوسری طرف گیا تو نیچے زینہ جاتا تھا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ نیچے آخری سیڑھی کے اوپر بھی ہلکی روشنی والا بلب روشن تھا۔ یہاں بھی ایک دروازہ تھا جس پر تالا پڑا تھا۔ میں نے اسے بھی پستول کے فائر سے اڑا دیا۔ دروازہ

کھولا اور دوسری طرف آگیا۔

سب سے پہلے میں نے جس شے کو دیکھا وہ ایک آدمی تھا جو ننگے فرش پر اوندھا ہو کر پڑا تھا۔ فائر کی آواز سے اس نے گردن ذرا سی اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کمانڈر شیروان کو اس زخمی اور نقاہت کی حالت میں بھی پہچان لیا۔ میں نے جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر آہستہ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! ہم آپ کو لے جانے آئے ہیں۔ کیا آپ چل سکتے ہیں؟"

کمانڈر شیروان نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر جس پر زخموں کے نشان تھے اور جو کمزور ہو رہا تھا اس پر رونق سی آگئی کہنے لگا

"میں چل سکتا ہوں"

میں کمانڈر شیروان کو اپنے پیچھے پیچھے چلاتا سیڑھیاں چڑھ کر تہہ خانے کے دوسرے دروازے سے باہر آیا تو کمانڈو منصور احمد بٹ کو پستول ہاتھ میں لئے ایک طرف گھات میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمانڈر شیروان کو گلے لگالیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"جلدی سے اوپر چھت پر چلو۔ منصور احمد بٹ! میں آگے جاؤں گا۔ اوپر دو آدمی پہرے پر ہوتے ہیں۔"

میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت والے دروازے کی آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ میں۔ گردن ذرا باہر نکال کر چھت پر نگاہ ڈالی۔ اپنے مجاہد کے جاسوس نے جو نقشہ بتایا تھا بالکل وہی نقشہ تھا۔ ہم قلعے کی چھت کی مشرقی سمت نکلے تھے۔ سامنے کافی کشادہ پرانی چھت تھی جس کے کنارے پر سیمنٹ اور اینٹوں کی بنی ہوئی پرانی مچان تھی جہاں فوج کے زمانے میں مشین گن کی پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ میں نے دور سے ایک سپاہی کو آتے دیکھا۔ اس نے رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور بڑی آہستہ آہستہ دیوار کی دوسری جانب دیکھتا چلا آرہا تھا۔ میں نے سیڑھیوں میں نیچے منہ کر کے ہلکی سی سیٹی بجا کر کمانڈو منصور احمد بٹ کو اشارہ دیا کہ ہوشیار رہے۔

سپاہی میری طرف ہی آرہا تھا۔ شاید وہ نیچے جانے والا تھا۔ میں سیڑھیوں میں ایک طرف ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میری ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس سپاہی کو حلق سے آواز نکالنے یا رائفل کا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملنی چاہئے۔ یہ سپاہی ہندو ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ سکھ نہیں تھا۔ وہ واقعی سیڑھیاں اتر کر نیچے جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں کی چوکھٹ کے سامنے آیا میرے ہاتھ میں جو آٹومیٹک پستول تھا اس میں سے ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ دو فائر ہوئے اور دونوں گولیاں سپاہی کے سینے میں اتر گئیں اور وہ دھڑام سے سیڑھیوں میں منہ کے بل گر پڑا۔ میں اسے کھینچ کر چھت پر لے گیا۔ وہ ابھی زندہ تھا میں نے ایک فائر اس کے سر میں کیا۔ وہ بے حس ہوگیا۔ میں نے اس کی رائفل پاؤں سے دور کردی۔ نیچے سے کمانڈو منصور احمد بٹ اور کمانڈر شیروان اوپر آگئے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ کے کاندھے پر رسی کا گچھا تھا۔ ہم دوڑ کر سیمنٹ کی مچان کے اندر گھس گئے۔ وہاں دو سوراخوں میں رسی کو کس کر باندھا اور رسی کو قلعے کی دیوار کی دوسری طرف نیچے پھینک دیا۔

کمانڈو منصور احمد بٹ چھت پر مچان کے کونے میں پستول لئے اس طرح بیٹھا رہا کہ اگر کوئی دوسرا سپاہی اس طرف آرہا ہو تو اسے بھی وہیں ختم کر دیا جائے۔ مگر وہاں اس وقت صرف ایک ہی سپاہی گشت لگا رہا تھا جس کی لاش سیڑھیوں والے دروازے کی ایک طرف پڑی تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان سے پوچھا۔

"آپ رسی کو پکڑ کر نیچے اتر سکیں گے؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"شیر زخمی ہوا ہے مرا نہیں"

میرا خیال تھا کہ میں پہلے کمانڈو منصور احمد بٹ کو نیچے اتاروں گا۔ کیونکہ اس کے پاس اسلحہ تھا مگر میرے دیکھتے دیکھتے کمانڈر شیروان نے رسی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنا چہرہ دیوار کی طرف کیا اور دونوں پاؤں دیوار کے ساتھ لگا کر آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کردیا۔ میں نے کمانڈو منصور کو اشارہ کیا۔ وہ بھی نیچے اترنے لگا۔ میں پستول لئے اوپر

دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ کبھی چھت پر سیڑھیوں کی طرف دیکھتا اور کبھی سر جھکا کر نیچے ان دونوں مجاہدوں کو قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر نیچے اترتا دیکھ لیتا۔ جب دونوں نیچے اتر گئے تو میں بھی نیچے اتر گیا۔

نیچے قلعے کی دیوار کے ساتھ چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ چونکہ اس کمانڈو ایکشن کا پروگرام ہنگامی حالت میں اچانک بن گیا تھا اس لئے ہم یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ کمانڈر شیروان کو قلعے سے نکال کر کس طرف لے جانا چاہئے اگر دوسری رات کو اس منصوبے پر عمل کیا جاتا تو ہم نے کمانڈر شیروان کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کا پہلے سے انتظام کر لیا ہوتا۔ مگر ہمیں اچانک یہ کمانڈو آپریشن کرنا پڑ گیا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب جیسے بھی ہو ہمیں اپنے مجاہد کے گھر کا ہی رخ کرنا چاہئے اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دن کا اجالا ہونے والا تھا۔ اور قلعے کے اندر پنجاب پولیس کے تین سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور نیچے والی دونوں لاشوں کا تو فوراً ہی پتہ چل جانا تھا اور پھر پولیس کو کمانڈر شیروان کے فرار کا بھی علم ہو جانا تھا اور اس کے بعد امرتسر شہر میں ایک طرح سے ہنگامی صورت حال پیدا ہو جانی تھی اور پولیس کے ساتھ ملٹری انٹیلی جینس اور ملٹری پولیس نے بھی جگہ جگہ ہماری تلاش شروع کر دینی تھی۔ میں نے منصور احمد بٹ سے کہا۔

"واپس اپنے ساتھی کے مکان پر چلتے ہیں"

اس نے کہا۔

"او کے"

اور ہم کمانڈر شیروان کو لے کر ریگو برج کی طرف تیز تیز چلنے لگے۔ کمانڈر شیروان کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن وہ بھی اس وقت ہمارے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا۔ جس وقت ہم دائم گنج کی بستی میں داخل ہوئے اس وقت آسمان پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔ سردی کی وجہ سے گلیوں میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں نے مجاہد کے مکان پر آ کر دستک دینے کی بجائے دروازے کو اندر کو دھکیلا۔

دروازہ کھلا تھا۔ مجاہد نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ میں دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگاؤں گا۔ ہم تینوں مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ اوپر مجاہد جاگ رہا تھا اس نے آواز دی۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہم ہیں"

اوپر آ کر مجاہد نے ہمارے ساتھ کمانڈر شیروان کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ کمانڈر شیروان کو اور کمانڈر شیروان اس کو جانتا تھا۔ اس نے کچھ پوچھے بغیر جلدی سے چارپائی پر بستر ٹھیک کیا۔ ہم نے کمانڈر شیروان کو لٹا دیا اور اوپر کمبل ڈال دیا۔ کمانڈر کے چہرے پر انتہائی نقاہت طاری تھی۔ اس کی بائیں گال پر سگریٹ سے جلنے کے کتنے ہی نشان تھے۔ نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجاہد سے کہا۔

"تم سب نے بڑا کام کیا ہے۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے"

اس کے بعد کمانڈر پر غشی سی طاری ہو گئی۔ مجاہد کو ہم نے سارا قصہ سنایا تو وہ بولا۔

"تم لوگوں نے ٹھیک وقت پر سب کچھ کیا"

ہم نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس پر بڑا گھناؤنا تشدد کیا گیا تھا۔ اس کی گردن پر بھی زخم کے لمبے لمبے نشان تھے۔ ایک آنکھ کے نیچے سیاہ داغ ابھرا ہوا تھا۔ مجاہد نے کہا۔

"تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں گرم پانی لاتا ہوں"

وہ پانی گرم کر کے لے آیا۔ ہم اس میں کپڑا گیلا کر کے کمانڈر کے چہرے کے زخموں کو لگانے لگے۔ تھوڑی دیر میں کمانڈر کو ہوش آ گیا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ اس کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

ہم لوگوں کو اس مکان میں بند ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران کمانڈر کی کھوئی ہوئی طاقت کافی حد تک واپس آچکی تھی۔ مجاہد ہمیں باہر کی ایک ایک پل کی خبر لا کر دیتا تھا۔ پنجاب پولیس خاص طور پر امرتسر کی خفیہ اور سول پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس پورے علاقے کو اپنے محاصرے میں لے چکی تھی اور شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ کمانڈر شیروان کے فرار اور قلعے کے تین سپاہیوں کے قتل کے سنگین واقعے کو مشرقی پنجاب کی پولیس نے خفیہ رکھا تھا اور اخباروں میں خبر شائع نہیں ہونے دی تھی مگر شہر کے لوگوں نے پولیس کی سرگرمیوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔ ہمارا پروگرام وہاں سے کسی طرح جموں کشمیر کی طرف نکل جانے کا تھا مگر اپنے مجاہد کے آدمی جو رپورٹیں لا رہے تھے ان کے مطابق شہر سے باہر نکلنے والی چڑیا کی بھی پولیس تلاشی لے رہی تھی۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجاہد نے ہمیں اوپر والی بیٹھک دے رکھی تھی۔ ہم سارا دن ساری رات اسی بیٹھک میں رہتے۔ رات کو بجلی کی روشنی نہیں کرتے تھے۔ موم بتی جلا لیتے تھے۔ ہم کمرے کی کھڑکیاں بھی نہیں کھولتے تھے۔ چونکہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے گزارا ہو رہا تھا۔ صرف رات کو کسی وقت ہم ایک ایک کر کے مکان کی چھت پر ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ مگر اس وقت بھی ہم چھت کی منڈیروں کے قریب نہیں آتے تھے کہ باہر سے ہم پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

ہم چاہے کوئی بھی سکیم کیوں نہ بناتے۔ اس سکیم پر عمل کرنے کے لئے اس مکان

سے نکلنا ضروری تھا۔ اور اس مکان سے نکلنا اور پھر شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا یہ ایک خطرناک عمل تھا اور ہمارے پکڑے جانے کا خدشہ بلکہ یقین تھا۔ کیونکہ پولیس شہر میں جگہ جگہ اجنبی آدمیوں کو روک کر ان کی تلاشی لے رہی تھی۔ مجاہد نے ہمیں بتایا کہ پولیس شک شبے میں امرتسر کے کئی کشمیری مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ یہ کشمیری وہاں برس ہا برس سے محنت مزدوری کر رہے تھے۔ رات کے وقت بھی بقول اپنے مجاہد کے شہر کے بازاروں' ریل کے پلوں اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر پولیس گشت لگاتی رہتی تھی اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر تو پولیس نے خاص طور پر ناکہ بندی کی ہوئی تھی اور شہر سے باہر کوئی بس' کوئی رکشا' تانگہ گاڑی اور پیدل سوار تلاشی دیئے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن ہم وہاں زیادہ دیر ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں وہاں بند ہو کر پڑے ہوئے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ خطرہ تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ یہ علاقہ ویسے بھی اس قلعے کے قریب تھا۔ جہاں سے ہم کمانڈر شیروان کو نکال کر لے آئے تھے اور تین پولیس کانسٹیبلوں کا خون بھی کر کے آئے تھے۔ اس علاقے میں خفیہ پولیس برساتی مینڈکوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے مجاہد نے بھی ہمیں کہا کہ اس نے خفیہ پولیس کے دو آدمیوں کو دائم گنج کی بستی میں چلتے پھرتے اور لوگوں کا جائزہ لیتے دیکھا ہے۔ ہم اپنے مجاہد کو بھی کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ ہماری تحریک کے لئے بے مثال کام کر رہا تھا۔ اس کا اپنے محاذ پر محفوظ رہنا بڑا ضروری تھا۔ لیکن ہمیں بھی یہاں سے جموں کشمیر کی طرف نکل جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں' کمانڈو منصور اور کمانڈر شیروان دن میں کتنی بار سر جوڑ کر بیٹھتے اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچتے مگر کوئی ترکیب قابل عمل دکھائی نہیں دیتی تھی۔

آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔

میں نے کمانڈر شیروان اور کمانڈو منصور احمد بٹ کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

"یہاں سے فرار کی ایک سکیم میرے دماغ میں آئی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس

ترکیب پر عمل نہ کیا تو پھر عین ممکن ہے کہ ہمیں اپنی باقی کی عمر اسی مکان کے اندر گزار دینی پڑے“

جب میں نے انہیں اپنی سکیم بتائی تو کمانڈر شیروان نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں اس طرح ہمارا یہاں سے فرار ہو جانے کا چانس ہے“

کمانڈو منصور بٹ سے مشورہ لیا گیا تو اس نے بھی میری سکیم کی حمایت کی۔ سکیم کوئی اتنی آسان نہیں تھی۔ اس میں ہر قدم پر پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ لیکن ہم کسی منصوبے پر بھی عمل کرتے اس میں پکڑے جانے کا ڈر تو موجود ہی ہوتا میری سکیم کی اچھی بات یہ تھی کہ ہم بڑی تیزی سے خطرے والے علاقے سے نکل سکتے تھے۔

میرا منصوبہ کیا تھا؟ یہ آپ کو تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گا۔ اس منصوبے کے لئے خود اعتمادی اور جرات انداز کی ضرورت سب سے زیادہ تھی اور یہ دونوں خصوصیات مجھ میں اور کمانڈر شیروان میں موجود تھیں۔ ہمیں کمانڈو منصور احمد بٹ پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ایک نو آموز کشمیری کمانڈو تھا اور اسے نہ صرف یہ کہ ابھی اس قسم کے دلیرانہ کمانڈو آپریشن کا تجربہ نہیں تھا بلکہ اس کی تربیت بھی پورے ڈھنگ سے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے آپس میں الگ ہو کر جب مشورہ کیا تو ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ کمانڈو منصور احمد بٹ کو الگ روانہ کرنا ہو گا۔ منصور احمد بٹ کشمیری تھا۔ بڑی روانی سے کشمیری اور ڈوگری زبان بول لیتا تھا۔ ویسے بھی ایک آدمی وہاں سے کسی بھی طرف نکل سکتا تھا۔ اور منصور احمد بٹ کشمیری النسل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو کشمیری محنت کش ظاہر کر کے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کمانڈر شیروان اور میں اس لئے الگ الگ نہیں نکل سکتے تھے کہ پنجاب پولیس میری شکل صورت سے تو پہلے ہی آشنا تھی اب کمانڈر شیروان کی صورت بھی پہچانتی تھی۔

جب ہم نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہاں سے اپنے طور پر جموں کشمیر کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کمانڈر شیروان نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ یہ فیصلہ اس کی کم تجربہ کاری کی وجہ سے کیا

گیا ہے بلکہ اسے یہی کہا کہ تین آدمیوں کا بیک وقت ایک جگہ سے اکٹھے ہو کر فرار ہونا اور ایک ساتھ رہنا زیادہ خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

”منصور احمد بٹ! تم جموں کشمیر کے چپے چپے سے اور ہماچل پردیش کے سارے پہاڑی علاقے سے واقف ہو۔ ایک بار تم پنجاب سے نکل گئے تو تمہارے لئے جموں کشمیر پہنچنا کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ جب کہ ہم دونوں کی صورت شکل سے پولیس واقف ہے۔ ہمیں فرار کے لئے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر ہم پکڑ لئے گئے تو تم بھی ہمارے ساتھ پکڑے جاؤ“

منصور احمد بٹ بولا۔

”کمانڈو! مجھے آپ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ میں آج رات کو ہی امرتسر میں اپنے کشمیری محنت کش بھائیوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ وہ مجھے یہاں سے نکالنے میں میری مدد کریں گے“

ہم نے اپنے مجاہد ساتھی کو یہ سکیم بتائی تو وہ کہنے لگا۔

”آپ کو اپنے فرار کے سلسلے میں جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ مجھے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں۔ ساری چیزیں آپ کو مہیا ہو جائیں گی۔“

میں نے کاغذ پر ساری چیزیں جن کی ہمیں ضرورت تھی لکھ کر اپنے مجاہد کے حوالے کر دیں۔ اس زمانے میں امرتسر میں ایک ایئرپورٹ بن چکا تھا۔ انڈین ایئر لائنز کی اندرون ملک کی تین پروازیں جموں کشمیر کو آتے جاتے امرتسر رکتی تھیں۔ ہماری سکیم انڈین ایئر لائنز کے کسی ہوائی جہاز میں سوار ہو کر سری نگر پہنچنے کی تھی۔ یہ سکیم خطرناک اور مشکل ضرور تھی مگر اس میں ایک بات تھی کہ اگر ہمارا راز نہیں کھلتا تو ہم گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ کمانڈر شیروان نے میری سکیم کی تائید بھی اسی واسطے کی تھی کہ اگر خطرہ ہر منصوبے میں موجود ہے تو پھر ایسا خطرہ کیوں نہ مول لیا جائے جس میں صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا ہی خطرہ ہو۔

دلی سے سری نگر براستہ امرتسر انڈین ایئر لائنز کے جو جہاز آتے جاتے تھے اس میں

پینتالیس مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی۔ یہ ٹرائیڈنٹ جہاز تھے جن کو پنکھوں والے دو یا میرا خیال ہے تین انجن لگے ہوتے تھے۔ اپنے مجاہد کے ذریعے ہم نے ایک دن بعد کی رات کے سات بجے والی امرتسر سری نگر فلائٹ میں دو سیٹیں بک کروالیں اور کنفرم بھی کروالیں۔ ہمارے پاس تیاری کرنے کے واسطے پورا ایک دن تھا۔ کمانڈو غنی ڈار تو رات کو ہی وہاں سے نکل چکا تھا اور صبح اپنے مجاہد نے آکر ہمیں بتادیا تھا کہ غنی ڈار امرتسر میں مقیم محنت کش کشمیریوں کے اڈے پر پہنچ گیا ہے۔ اب ہم نے تیاری شروع کردی۔ مجاہد کو ہم نے جو چیزیں لکھ کردیں تھیں وہ اس نے ہمیں لاکردے دی تھیں۔ وہ چیزیں کیا تھیں۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ انڈین آرمی کی ہرے رنگ کی دو وردیاں تھیں۔ ایک وردی میجر کی تھی اور دوسری وردی صوبیدار میجر کی تھی۔ آرمی کی پرانی استری کی ہوائی وردیاں اور ان کے عہدوں کے نشان شہر کی ایک دکان پر مل جاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انڈیا کے ہر بڑے شہر میں اور خاص طور پر فوجی چھاؤنیوں والے شہروں میں ایسی دکانیں ضرور ہوتی ہیں جہاں سے فوجی وردیاں' عہدوں کے نشان وغیرہ سیکنڈریٹ پر مل جاتے تھے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان وردیوں کو دکانوں پر کھلے عام فروخت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بمبئی کا ایک لنڈا بازار ہے جس کو چور بازار کہا جاتا ہے۔ وہاں تو پرانی فوجی وردیاں تین چار دکانوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ بہرحال ہم نے اپنی اپنی وردیاں پہن لیں۔ میں نے صوبیدار میجر کی اور کمانڈر شیروان نے میجر کی وردی پہن لی۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس آئی ڈی کارڈ اور پے بکیں نہیں تھیں۔ ان چیزوں کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہمیں ان کے بغیر ہی انڈین ایئر لائنز کے جہاز میں سفر کرنا تھا۔ خیال تھا کہ جہاز میں کون ہماری چیکنگ کرے گا۔ ہوائی اڈوں پر عام حالات میں ملٹری پولیس بھی نہیں ہوتی۔ اور ملٹری پولیس کسی میجر یا صوبیدار میجر کو روک کر یہ کبھی نہیں پوچھتی کہ پے بک اور شناختی کارڈ دکھاؤ جہاز میں ہم نے اپنے مجاہد کے ذریعے شام کی فلائٹ میں امرتسر سے سری نگر تک کی دو سیٹیں بک کرانے کے بعد کنفرم بھی کروالی تھیں۔ ایک سیٹ میجر ایم کشور ورما کے نام کی اور دوسری سیٹ صوبیدار میجر پیارے لال

کے نام کی تھی۔ ہماری وردیوں پر عہدوں کے نشان کے نیچے ڈوگرہ رائفلز کے الفاظ بھی موجود تھے۔ آٹومیٹک پستول پہلے سے ہی ہمارے پاس تھے۔ ہم نے انہیں اپنی بیلٹ کے ہولسٹر میں لگا لیا تھا۔ تھوڑی انڈین کرنسی ہم نے آپس میں بانٹ کر اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لی تھی۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے کیا ہو اور کہاں ہمیں ان پیسوں کی ضرورت پڑجائے۔

سردیوں کے موسم کی وجہ سے تیسرے پہر چھ بجے ہی شام ہوگئی۔ ہم نے اپنے مجاہد سے لائن کلیئر مانگا۔ وہ نیچے گلی میں چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد آیا کہنے لگا۔

"راستہ صاف ہے۔ آپ لوگ آبادی کے عقب سے ہو کر خالصہ کالج کی طرف سے سڑک پر نکل آئیں۔ وہاں سے آپ کو ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ مجاہد کے مکان سے نکل کر ہم اندھیری گلیوں میں سے گزر کر پیچھے کھیتوں کی طرف آگئے وہاں سے خالصہ کالج کی طرف چلنے لگے۔ خالصہ کالج سے ہم بڑی سڑک یعنی جی ٹی روڈ پر آگئے۔ یہاں ہمیں ٹیکسی کا انتظار کرنا تھا مگر کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ فلائٹ کی روانگی کا ٹائم بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک موٹر رکشا لے لیا اور پندرہ منٹ میں ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ٹکٹ ہماری جیبوں میں تھے۔ ایئر پورٹ پر کوئی زیادہ رش نہیں تھا۔ لابی میں کچھ سکھ اور ہندو سیٹھ اور ایک دو فیملیاں ہی تھیں۔ فلائٹ نمبر کے کاؤنٹر پر چار پانچ ہندو سکھ قطار میں بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ ہم بھی فوجی انداز میں گردن اٹھائے چلتے ہوئے آکر قطار میں کھڑے ہوگئے۔ کاؤنٹر پر جو عورت کمپیوٹر کے سامنے کھڑی سیٹوں کی ریزرویشن دیکھ کر بورڈنگ کارڈ ایشوع کر رہی تھی اس نے دو فوجی افسروں کو دیکھا تو ساتھ والے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔

ساتھ والا کاؤنٹر خالی تھا اور وہاں بھی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ یہ کاؤنٹر شاید فوجیوں کی سہولت کے لئے تھا۔ ہم اس کاؤنٹر پر آگئے۔ میں نے اپنا اور کمانڈر شیروان کا ٹکٹ لڑکی کو دیا۔ اس نے کمپیوٹر پر ٹک ٹک شروع کردی۔ ہمارے ناموں کے ساتھ سیٹیں ریزرو ہو چکی تھیں۔ اس نے ہمیں بورڈنگ کارڈ دے دیئے۔ ہم کارڈ لے کر ڈیپارچر لاؤنج کی

طرف چل پڑے۔ کمانڈر شیروان فوجی میجر کی شان سے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں جونیئر افسر کی حیثیت سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ ڈر ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں سے کوئی ملٹری پولیس یا امرتسر پولیس کا کوئی آدمی اچانک نکل کر سامنے نہ آجائے اور کمانڈر شیروان کو اور مجھے پہچان نہ لے۔ جہاں ہم نے بورڈنگ کارڈ دکھائے وہاں ڈی ٹیکٹر راڈ سے ایک اہل کار نے ہماری برائے نام چیکنگ کی اور آگے جانے کی اجازت دے دی۔ ہم ڈیپارچر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ ہم خاموش تھے اور آپس میں کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اپنی اپنی جگہ پر ہم دونوں چوکس تھے اور نظریں بچاکر ماحول کا برابر جائزہ لے رہے تھے۔ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ کام تو بڑا آسان ہے۔ بازار سے فوجی وردی لے کر پہنی اور دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئے۔ نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ اس کام کے لئے ایک تو تجربہ چاہئے اور دوسرے کمانڈو ٹریننگ کے ساتھ ساتھ دل گردہ بھی چاہئے۔ یہ سب صلاحیتیں ہم دونوں میں موجود تھیں۔ میں خود کئی بار مختلف بھیس بدل کر دشمن کی آنکھوں کے سامنے اس کے درمیان سے ہو کر فرار ہوا تھا۔ کمانڈر شیروان بھی ایک اعلیٰ تربیت یافتہ اور تجربہ کار کشمیری کمانڈو تھا اور مختلف بھیس بدل کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے جاکر کئی دھماکے کر کے دشمن کو شدید نقصان پہنچا چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں انگریزی بول اور سمجھ لیتے تھے۔ مجھے تو گجراتی اور ہندی زبان بھی اچھی طرح آتی تھی اور سنسکرت کے اشلوک بھی زبانی یاد تھے۔ ہندو دیو مالا کا بھی میں ماہر تھا۔ فوجی رولز اور ریگولیشنز سے بھی ہم دونوں بخوبی واقف تھے۔ بھرے ہوئے سائی لینسر والے آٹومیٹک پستول ہماری پیٹی میں لگے تھے۔ ہم نے اس خیال سے ہولسٹروں کے بٹن بند نہیں کئے تھے کہ کچھ پتہ نہیں کب اچانک پستول استعمال کرنا پڑ جائے۔

لاؤنج میں بتیاں روشن تھیں۔ ہم خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہمارے آس پاس کی سیٹیں خالی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے گھڑی دیکھی اور کہا۔

"فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے"

پھر اس نے دائیں جانب سر گھما کر دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا آہستہ سے کہنے لگا۔

"ایک ملٹری پولیس کا آدمی کونے میں آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ اگر کوئی ایمرجنسی بن گئی تو ندھا دھند فائرنگ شروع کرنی ہوگی مگر سب سے پہلے ملٹری پولیس کے جوان کو ختم کرنا ہوگا۔"

میں نے بڑے بہانے سے گردن ذرا سی موڑ کر پیچھے دیکھا تو جہاں چائے کا کاؤنٹر تھا ہاں ایک ملٹری پولیس کا جوان مستعد ہو کر کھڑا تھا۔ یہ جوان ہمیں پہلے وہاں نظر نہیں آیا ا۔ مجھے فکر لگا کہ کہیں معاملہ خراب تو نہیں ہوگیا۔ کسی نے ہماری مخبری تو نہیں کردی۔ ں نے کمانڈر شیروان سے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہاں سے چونکہ اکثر فلائیٹیں مقبوضہ جموں کشمیر کی طرف جاتی ہیں اور یہاں فوج ی نقل و حرکت جاری رہتی ہے۔ اس لئے یہ ایم پی کا جوان ڈیوٹی دینے آگیا ہوگا۔"

اتنے میں اعلان ہوا کہ سری نگر جانے والی فلائٹ پرواز کے لئے تیار ہے مسافروں ے انرود ہے کہ وہ کرپا کر کے جہاز میں سوار ہو جائیں۔

ہم بھی اٹھے اور دوسرے مسافروں کے ساتھ گیٹ سے نکل کر جہاز کی طرف بڑھے وہاں سے تھوڑے فاصلے پر رن وے کی ایک طرف کھڑا تھا۔ اسے سیڑھی لگی ہوئی تھی یہ جیٹ جہاز نہیں تھا۔ بڑا بھی نہیں تھا۔ تھوڑے مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ز کی سیڑھی کی دونوں جانب ایئرپورٹ کے دو آدمی کھڑے بورڈنگ کارڈ چیک کر رہے ے۔ ہم سیڑھی چڑھ کر جہاز کے دروازے پر آئے تو وہاں دو انڈین ایئر ہوسٹس کھڑی ں۔ دبلی پتلی اور خوبصورت تھیں۔ دونوں نے ایئر ہوسٹسوں کی وردی والی ساڑھیاں ن رکھی تھیں۔ ایک ایئر ہوسٹس نے ہم سے کارڈ کا بقایا لے لیا۔ سیٹوں کے نمبر پڑھے ہمیں ساتھ لے کر ہماری سیٹوں تک آئی۔ ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ جہاز آدھا ا تھا۔ اپنے وقت پر جہاز ٹیکسی کرتا' ٹیک آف کے پوائنٹ پر آکر رک گیا۔ پھر اس پنکھے پوری سپیڈ سے گھومنے لگے اور ایک دھچکے سے جہاز آگے کو بڑھا اور اس کی ر تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

اس کے بعد وہ ٹیک آف کر گیا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ امرتسر

شہر کی روشنیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاز ایک خاص بلندی پر آ کر اپنی خاص رفتار پر سیٹ ہو گیا۔ میں نے سر کھڑکی والے شیشے کے قریب لاتے ہوئے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے"

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سری نگر ایئرپورٹ پر ہمیں چوکس رہنا ہوگا"

میں اثبات میں سرہلا کر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ جہاز کو پرواز کرتے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ جہاز کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ مسافروں کے رنگ اڑ گئے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید تھا اور جہاز نے ایک طرف جھکولا بھی کھایا۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایئر ہوسٹس مسافروں کو مطمئن رہنے کی تلقین کرنے لگیں۔ لیکن جہاز کو تھوڑی دیر کے بعد برابر ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اب مرد مسافر بھی گھبرا گئے تھے۔ ہندو رام نام کا جاپ کرنے لگے۔ سکھوں نے گربانی پڑھنی شروع کر دی۔

چند جھٹکوں کے بعد جہاز جیسے ایک طرف کو جھک گیا۔ پھر سیدھا ہو گیا۔ مسافروں پر سخت گھبراہٹ طاری تھی۔ میں اور کمانڈر شیروان بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ کہیں جہاز کنٹرول سے باہر نہ ہو جائے۔ اتنے میں جہاز کے کیپٹن کی آواز سپیکر پر سنائی دی۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین"

جہاز کے کیپٹن نے بتایا کہ جہاز کے دو انجنوں میں کوئی ٹیکنیکل خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے ہمیں کچھ دیر کے لئے مجبوراً انبالے کے ایئرپورٹ پر اترنا پڑ رہا ہے۔ اس تکلیف کے لئے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کمانڈو کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے میں نے کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا"

کیونکہ انبالے میں انڈین آرمی کی بہت بڑی چھاؤنی تھی اور وہاں ایئرپورٹ پر ملٹری پولیس ہر وقت موجود رہتی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر حریت پسند مجاہدین بھارتی غاصب فوجیوں

پر گھات لگا کر حملے کر رہے تھے اور ان کے اسلحہ سے لدے ہوئے فوجی ٹرک اور فوجیوں کو اڑا رہے تھے اس لئے اس سارے علاقے میں اور خاص طور پر انبالے اور جالندھر چھاؤنی کے علاقے میں ملٹری پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کی سرگرمیاں بہت تیز تھیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں ملٹری انٹیلی جینس اور ملٹری پولیس والے کسی بھی فوجی کے کاغذات چیک کر سکتے ہیں خواہ فوجی افسر کتنے بڑے عہدے والا کیوں نہ ہو۔ یہ ساری باتیں ہمارے ذہن میں تھیں۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"ہم انبالہ ایئرپورٹ پر ہی رہیں گے۔ اگر ایئرلائن والوں نے دوسرے مسافروں کے ساتھ ہمیں بھی کسی ہوٹل میں چلنے کے لئے کہا تو ہم نہیں جائیں گے اور ایئرپورٹ ہی کے کسی کونے میں بیٹھ جائیں گے۔"

کمانڈو بولا۔

"ایسا ہی کریں گے"

اگرچہ ہماری اگلی پچھلی سیٹیں خالی تھیں۔ پھر بھی ہم دھیمی آواز میں انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ جہاز انبالہ ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ مسافروں کو ارائیول لاؤنج میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہاں بتایا گیا کہ جہاز میں کچھ زیادہ ہی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اب یہ جہاز سری نگر نہیں جائے گا۔ سری نگر جانے والی فلائٹ صبح آٹھ بجے دلی سے انبالے پہنچے گی اور مسافروں کو اس میں سوار کرا کر سری نگر پہنچایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ تمام مسافروں کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام ایئرپورٹ کے ہوٹل میں کر دیا گیا ہے۔ مسافروں پر بیزاری طاری ہو گئی۔ مسافروں کو ایئرپورٹ کے ہوٹل کی طرف لے جایا جانے لگا تو ہم بھی ساتھ ہو گئے۔ جب ایئرپورٹ کے باہر پہنچے تو ہوائی جہاز کے بر سر نے ہمارے پاس آ کر کہا۔

"سر! آپ میرے ساتھ تشریف لے آئیں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام ہوٹل کے ملٹری ونگ میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہم بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی رات گزار لیں گے۔"

کیونکہ ملٹری ونگ کے نام سے ہم محتاط ہو گئے تھے۔ برسر نے کہا۔

"سر! ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی فوجی افسر سویلین کے ساتھ رات نہیں گزار سکتا۔ سر! آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ یہاں سیکورٹی کا کتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

جب کمانڈر شیروان نے دوسرے مسافروں کے ساتھ ٹھہرنے پر زیادہ اصرار کیا تو برسر کہنے لگا۔

"سر! اس کے لئے آپ کو ملٹری پولیس کے کیمپ میں چل کر وہاں کے فوجی افسر سے بات کرنی ہوگی۔"

اب مجبوری تھی۔ ہم کسی فوجی افسر کے پاس نہیں جانا چاہتے تھے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کمانڈر شیروان کو اشارہ کیا کہ ملٹری ونگ کی طرف ہی چلے چلتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ ہوٹل ٹائپ کے دو چار کمرے ہوں گے۔ وہیں رات گزار لیں گے۔ کمانڈو نے برسر سے کہا۔

"اوکے! ایسی بات ہے تو ہم ڈسپلن کی پابندی کریں گے۔ چلو ہمیں ملٹری ونگ میں ہی لے چلو"

ایئرپورٹ کے ہوٹل کی عمارت کے پہلو میں ایک بارک سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ احاطے کے اردگرد خاردار تار کی باڑھ لگی تھی۔ گیٹ پر چھوٹا سا بوتھ بنا ہوا تھا۔ ملٹری پولیس کے دو جوان سٹین گنیں کاندھے سے لٹکائے گیٹ کی دونوں جانب کھڑے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ برسر ہمیں ان کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ ملٹری پولیس کے جوانوں نے ہمیں دیکھ کر زور سے سیلوٹ مارا اور ایک جوان نے بڑے ادب سے کہا۔

"سر! آپ کا آئی ڈی اور پے بک نمبر ہمیں رجسٹر میں درج کرنا ہوگا۔ پلیز اپنا آئی ڈی کارڈ اور بک دے دیجئے۔"

اس وقت محسوس ہوا کہ ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ مگر کمانڈر شیروان نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ وہ میجر کی وردی میں تھا۔ اس نے رعب سے کہا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمارا آئی ڈی کارڈ اور پے بک دیکھنے والے ہم انڈین آرمی کے افسر ہیں۔ کوئی چور ڈاکو نہیں ہیں۔ چلو ہمیں ہمارا کمرہ دکھاؤ۔"

ملٹری پولیس نے ایک بار پھر ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کیا اور کہا۔

"سر! ہمیں کمانڈنگ آفیسر صاحب کا آرڈر ہے کہ ملٹری ونگ میں ہر فوجی کے آئی ڈی کارڈ اور پے بک کا اندراج ضرور کیا جائے۔ صاحب! یہ ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ پلیز؟؟"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر ہم اسے اپنا اپنا آئی ڈی کارڈ اور پے بک اس لئے نہیں دکھا سکتے تھے کہ یہ دونوں چیزیں ہم میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھیں۔ اب میں سامنے آگیا میں نے ملٹری پولیس کے سارجنٹ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم کیسا جنگلی آدمی ہے کہ میجر صاحب کو ڈسپلن کی ٹریننگ سکھاتا ہے؟ پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو ہم تمہاری رپورٹ کرے گا۔"

سارجنٹ میری فوجی انسٹرکٹروں والی اونچی آواز اور جھاڑ سے ڈر گیا۔ جلدی سے سلیوٹ مار کر بولا۔

"یس سر! اوکے سر!"

دوسرے سارجنٹ نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں اور کمانڈر شیروان بڑی شان سے ماطے میں داخل ہو گئے۔ سامنے برآمدے میں بھی ایک فوجی سپاہی کھڑا تھا جس نے رف وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سپاہی رینک کا جوان تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر سیلوٹ ا اور چابی لگا کر کمرہ کھول دیا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ اس نے بتی جلا دی اور ا۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو تو آرڈر کریں"

پلنگوں پر بستر بچھے تھے۔ کمبل تہہ کئے ہوئے پڑے تھے۔ تین کرسیاں دیوار کے ساتھ ا ہوئی تھیں۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔

"پانی وانی سب ٹھیک ہے جوان؟"

"یس سر! گرم پانی کی ٹونٹی الگ ہے سر!"

میں نے کہا۔

"فکر نہیں۔ اب تم جائے گا۔"

سپاہی سیلوٹ کر کے کہنے لگا۔

"کھانا لاؤں سر؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"نہیں جوان۔ کھانا ہم نے کھا لیا ہے۔"

سپاہی چلا گیا تو میں نے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ کھڑکی کے شیشے میں سے مجھے ملٹری ونگ کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باہر جو دو فوجی سارجنٹ پہرے پر کھڑے تھے اور جن کو ہم ڈانٹ ڈپٹ کر اپنا آئی ڈی کارڈ اور پے بک دکھائے بغیر آ گئے تھے ان میں سے ایک سارجنٹ تو گیٹ کے آگے کھڑا تھا اور دوسرا گیٹ کے چھوٹے سے بوتھ کے اندر کسی کو ٹیلی فون کر رہا تھا۔

میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھ کو خبردار کر دیا۔ میں نے کمانڈر شیروان کو وہ منظر دکھاتے ہوئے کہا۔

"معاملہ گڑبڑ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارجنٹ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ کر رہا ہے کہ ہم لوگ ڈسپلن کی خلاف ورزی کر کے اندر آ گئے ہیں"

اپنے سی او کو رپورٹ کرنا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ فوج میں ڈسپلن چلتا ہے۔ ڈسپلن کو توڑنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

کمانڈر شیروان بوتھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ شاید ایئرپورٹ والوں کو فون کر رہا ہے۔"

کمانڈر شیروان معاملے کی سنگینی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ اس نے مجھے بھی اس طرف سے

بے فکر ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ اور اگر سارجنٹ اپنے سی او کو ہمارے بارے میں بتا بھی رہا ہے تو سی او میرے میجر رینک کی وجہ سے کبھی ہمارا آئی ڈی کارڈ وغیرہ دیکھنے کے لئے یہاں نہیں آئے گا"

اور کمانڈو پلنگ پر وردی سمیت لیٹتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کچھ دیر سو جانا چاہئے۔"

کمانڈر شیروان نے اپنی فوجی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی تھی میں نے بھی اپنی صوبیدار میجر والی کلغی دار ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی۔ ہم نے کھڑکی کے آگے پردہ کر دیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا لیکن میرے دل کو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو شیروان آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ باہر چاروں طرف خاموشی تھی۔ میں لیٹا ہوا ضرور تھا مگر میری آنکھیں کھلی تھیں۔ ٹیلی فون کرنے والا ملٹری پولیس کا سارجنٹ میری نیند اڑا کر لے گیا تھا۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"میرا خیال ہے اگر ہم یہاں آنے کی بجائے انبالے کینٹ کے کسی ہوٹل میں چلے جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔"

کمانڈر شیروان آنکھیں اسی طرح بند کئے ہوئے بولا۔

"دوست! اب ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہوگا۔ بتی بجھا کر تم بھی سو جاؤ۔ صبح کی فلائٹ میں بڑے آرام سے سری نگر پہنچ جائیں گے۔"

لیکن میری بے چینی دور نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی بتی بجھا دی کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ایک طرف کر دیا۔ شیشوں میں سے گیٹ کی روشنی کا عکس کمرے میں پڑنے سے کمرے کی تاریک فضا بے معلوم انداز میں روشن سی ہو گئی تھی۔ لیکن باہر سے دیکھنے والے کو اندر کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف نگاہ ڈالی۔ دونوں ملٹری سارجنٹ گیٹ کے آگے چاق و چوبند کھڑے تھے۔

تب مجھے بھی خیال آیا کہ میں یونہی پریشان ہو رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ سارجنٹ نے کسی اور کو فون کیا ہو۔ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو فون کر کے ہمارے ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے کے بارے میں نہ بتایا ہو۔ کمانڈو شیروان نے پہلو بدلتے ہوئے نیند بھری آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ صبح صبح میری آنکھ کھل جایا کرتی ہے۔ شب بخیر"

میں نے آہستہ سے شب بخیر کہا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر یقین کریں نیند میری آنکھوں سے ایسی غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔ میں جتنا سونے کی کوشش کر رہا تھا نیند اتنی ہی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو دل ایک بار تو دھک سے رہ گیا۔

ایک فوجی جیپ گیٹ کے اندر داخل ہو کر ایک طرف رک گئی تھی۔ اندر سے دو فوجی باہر نکلے تو ملٹری پولیس کا سارجنٹ دوڑ کر ان کے پاس آگیا اور سلیوٹ کر کے دونوں بھارتی فوجیوں سے باتیں کرنے لگا۔ جب اس نے ہمارے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر کمانڈر شیروان کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو! کوئی فوجی افسر ادھر آرہا ہے۔ شاید یہ انڈین کمانڈنگ افسر ہے"

کمانڈر شیروان جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ٹوپیاں پہن لیں۔ کمانڈو بولا۔

"دوسری کھڑکی میں سے باہر نکل جاتے ہیں"

مگر اس کمرے کی دوسری کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ ایک ہی کھڑکی تھی جو برآمدے میں کھلتی تھی۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ دونوں فوجی ہمارے کمرے کی طرف چلے آرہے تھے۔ آگے آگے جو فوجی آرہا تھا اس کے ہاتھ میں چھوٹا بید تھا۔ وہ کیپٹن رینک کا افسر لگتا تھا۔ اس کے پیچھے جو ہری وردی والا بھارتی فوجی آرہا تھا اس کا اردلی لگتا تھا۔ دونوں سارجنٹ دور گیٹ پر ہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"باتھ روم! شاید باتھ روم میں کوئی کھڑکی ہو۔"

ہم باتھ روم کی طرف دوڑے۔ باتھ روم کی بتی جل رہی تھی۔ باتھ روم میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اندر سے کنڈی لگی تھی۔ میں نے کنڈی کھول کر دروازے کو دھکا دیا تو وہ دوسری طرف کھل گیا۔ اس دوران دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ انڈین فوجی افسر اپنے اردلی کے ساتھ ہمارے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگائی۔ بتی بجھائی اور ہم دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ باہر کیا ہے۔ اندھیرے میں پہلے تو ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر جھاڑیاں اور درختوں کے خاکے ابھر آئے۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے درختوں میں سے گزر گئے۔ آگے کانٹے دار تار کی باڑ آگئی۔ ہم اس کے ساتھ دوڑ کر تھوڑی دور گئے۔ باڑ واپس گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ ہمیں دور سے اپنے کمرے کے بند دروازے پر ہاتھ مارنے کی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک درخت خاردار باڑ کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ہم اس پر چڑھے اور ٹہنیوں کو پکڑ کر دوسری طرف کود گئے۔ ہم جھاڑیوں اور لمبی لمبی سوکھی گھاس میں گرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک جانب انبالہ چھاؤنی کے مکانوں اور بنگلوں اور سڑک کی روشنیاں تھیں۔ دوسری جانب اندھیرا تھا۔ ہم اندھیرے کی جانب دوڑنے لگے۔ دوڑتے دوڑتے میدان ختم ہو گیا۔ ایک چھوٹی پختہ سڑک کو عبور کر کے ہم دوسری جانب ویران علاقے میں داخل ہو گئے۔ ہم سخت جان کمانڈو تھے۔ کئی میل تک سانس لئے بغیر دوڑ سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے بات کئے بغیر مسلسل دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر آسمان پر ستارے بجھے بجھے سے لگتے تھے۔ اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں کے خاکے سے ہی نظر آرہے تھے۔ آگے ایک نہر آگئی یہ کافی چوڑی نہر تھی۔ ہم وہاں پر جا کر رک گئے نہر کنارے بیٹھ گئے۔ ذرا دم میں دم آیا تو کمانڈر شیروان کہنے۔

"دوست! تمہارا خدشہ درست تھا۔ پھر بھی ہم عین وقت پر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ورنہ ہمارا پکڑا جانا یقینی تھا۔"

میں نے کہا۔

"اگر باتھ روم کا دروازہ نہ ہوتا تو ہمارا نکلنا ناممکن تھا۔ پھر ہمیں اس بھارتی فوجی افسر کو ہی نہیں کسی بہانے اس کے اردلی کو بھی ختم کرنا پڑتا جو ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا؟"

کمانڈو نے پیچھے دیکھا۔ کہنے لگا۔

"میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ اس طرف ہمارے پیچھے آئیں گے"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے وہ انڈین ملٹری آفیسر اپنے اردلی کے ساتھ اس وقت تک دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکا ہوگا اور انہیں یقین ہوگیا ہوگا کہ ہم جعلی فوجی افسر تھے اور یقیناً دشمن ملک کے جاسوس تھے۔ اس اعتبار سے یقین کرو اس وقت تک انبالے چھاؤنی کی ساری ملٹری پولیس ہوشیار ہو چکی ہوگی اور ہماری تلاش میں اس طرف آرہی ہوگی۔ اس لئے یہاں سے جتنی جلدی بھاگ سکیں ہمیں بھاگ جانا چاہئے۔"

ہم نے نہر میں جھک کر تھوڑا سا پانی پیا اور نہر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ ایک جگہ نہر کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پار کر کے نہر کی دوسری طرف آگئے۔ پھر نہر کے کنارے سے اتر کر ان روشنیوں کی طرف رخ کرلیا جو دور سے ایک قطار میں جھلملا رہی تھیں۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"شاید یہ جی ٹی روڈ کی بتیاں ہیں۔ اس سڑک پر ہمیں جنوب کی طرف جانے والی کوئی لاری وغیرہ مل سکے گی"

کمانڈو دوڑتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں جالندھر امرتسر کی طرف نہیں جانا چاہئے۔ یہاں سے اگر ہم کسی طرح دلی پہنچ جائیں تو ہم کافی محفوظ ہو جائیں گے۔"

سڑک کی بتیاں قریب آئیں تو ہم دوڑنے کی بجائے چلنے لگے۔ سڑک پر ایک جانب کچھ کھوکھا نما دکانیں سی بنی ہوئی تھیں۔ شروع رات کا وقت تھا اور انبالہ کینٹ کوئی غیر

آباد جگہ نہیں تھی۔ ہم سڑک پر آگئے۔ سڑک کی ساخت اور اس پر دو رویہ درختوں کی قطار کو دیکھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ جی ٹی روڈ ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سڑک پر سے کوئی ٹرک وغیرہ بھی گزر جاتا تھا۔ ہم ایک طرف ذرا اندھیرے میں ہو کر کھڑے ہوگئے۔ سوچنے لگے کہ یہاں سے میرٹھ کی طرف جانے والی کوئی لاری وغیرہ پکڑ لیں گے۔ میں نے دیکھا کہ جالندھر لدھیانہ کی طرف سے ایک فوجی ویگن آئی اور سڑک کے پار کھوکھے والی دکان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ ویگن کی بتیاں بجھیں اور اگلی سیٹ پر سے ایک فوجی جو سپاہی لگتا تھا نکل کر کھوکھے کے پاس جا کر کچھ خریدنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہم اس فوجی ویگن میں سوار ہو کر آگے جائیں گے۔"

پھر میں نے کمانڈر شیروان کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ دوسرے لمحے کمانڈو شیروان ایک فوجی میجر کی طرح چلتا ہوا فوجی ویگن کی طرف بڑھا میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ویگن کے پاس جا کر کمانڈر شیروان نے ویگن کے بونٹ پر ہاتھ مار کر فوجی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ادھر کیا کر رہا ہے۔ واپس آؤ"

دبلا پتلا سپاہی دوڑ کر قریب آیا۔ اپنے سامنے بھارتی وردی میں ملبوس ایک میجر اور ایک صوبیدار میجر کو دیکھ کر اس نے زور سے سلیوٹ مارا اور بولا۔

"سر! سگریٹ لینے کو رک گیا تھا۔"

کمانڈر شیروان نے اسے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"پیچھے بیٹھو۔ ہمیں میرٹھ چھاؤنی تک جانا ہے۔ ہماری شاف کار خراب ہوگئی ہے گو"

بھارتی سپاہی نے جو واقعی سپاہی رینک کا تھا جلدی سے جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر کمانڈو کو دی اور خود سگریٹ کا پیکٹ پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے ویگن کے پیچھے سوار ہوگیا۔ میں اور کمانڈر شیروان اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کمانڈو شیروان بیٹھا تھا۔ اس نے انجن سٹارٹ کر کے بتیاں روشن کیں اور فوجی ویگن جی ٹی روڈ

پر میرٹھ کی طرف دوڑنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سڑک انبالہ چھاؤنی سے سہارنپور، دیوبند اور مظفر نگر سے ہوتی ہوئی میرٹھ کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بعد ہاپڑ، پھر غازی آباد اور دلی آتا تھا۔ انبالے ہی سے جی ٹی روڈ کی ایک شاخ کرنال پانی پت، سونی پت اور روہتک سے ہو کر دلی پہنچتی تھی۔ لیکن ہم سہارنپور والی سڑک پر پڑ چکے تھے۔ اس راستے سے میں کئی بار گزر چکا تھا۔ ہم کسی بڑے شہر میں جا کر ہی گم ہو سکتے تھے۔ چھوٹے شہر میں ہمارا پہچان لیا جانا اور پکڑے جانا یقینی تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں اپنا فوجی لباس بدل کر کوئی دوسرا لباس پہننے کی ضرورت تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان سے پوچھا کہ میرٹھ میں اپنا کوئی خاص آدمی موجود ہے یا نہیں۔

کمانڈو نے کہا۔

"دلی میں تو اپنے دو آدمی ہیں۔ جن میں ایک گل خان ہے۔ تم اسے مل بھی چکے ہو۔ مگر میرٹھ میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اپنا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

جیسے جیسے ہماری فوجی سٹیشن ویگن آگے بڑھ رہی تھی رات گہری ہو رہی تھی۔ بھارتی سپاہی پیچھے بیٹھا تھا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ یہ ہم نے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا کہ انبالے چھاؤنی سے نکلنے کے بعد اس بھارتی سپاہی کو اتار دیا جائے گا۔

جب ہم انبالے سے کافی دور نکل آئے تو کمانڈر شیروان نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ بھارتی سپاہی جلدی سے باہر نکل آیا۔

"سر! کیا بات ہے؟"

اس نے پوچھا۔

"کمانڈو نے بونٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"انجن گرم ہو گیا ہے۔ ادھر دیکھو کہیں سے پانی مل جائے تو ڈبہ بھر کر لے آؤ"

"یس سر!"

بھارتی سپاہی نے ویگن کے اندر سے ٹین کا ڈبہ نکالا اور کھیتوں میں پانی کی تلاش میں

چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو تین منٹ بعد ہم ویگن میں بیٹھ گئے۔ ویگن سٹارٹ ہوئی اور ہم اسے وہاں سے تیزی سے نکال کر آگے لے گئے۔ ہم سہارنپور دیوبند اور مظفر نگر سے بھی آگے نکل گئے۔ جس وقت ہم میرٹھ پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی۔ شہر میں داخل ہونے کی بجائے ہم نے ویگن شہر سے باہر ایک ماڈرن علاقے میں ایک گراؤنڈ کے پاس کھڑی کر دی۔ ہم ویگن سے اتر آئے۔ کمانڈو نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہاں ہمیں ویگن چھوڑ دینی چاہئے اور دن کسی ہوٹل میں گزارنے کے بعد رات کو دلی کی کوئی گاڑی پکڑنی چاہئے"

کمانڈو کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ کیونکہ اس وقت صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ہم نہ تو بذریعہ لاری اور نہ ہی بذریعہ ٹرین یا بذریعہ ہوائی جہاز میرٹھ سے واپس سری نگر کی طرف جا سکتے تھے۔ انبالے کی ملٹری پولیس نے انٹیلی جینس کو خبر کر دی ہو گی کہ دو آدمی فوجی وردی میں مفرور ہیں اور ان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ کشمیری جاسوس ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس کو پہلے ہی سے کمانڈر شیروان کی تلاش تھی۔ ملٹری انٹیلی جینس کو یقین ہو گیا ہو گا کہ دونوں جعلی فوجی افسروں میں سے ایک مفرور کشمیری کمانڈو ہی ہو سکتا ہے اور یہ اطلاع میرٹھ اور آگے دلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھی مل گئی ہو گی۔ دلی پہنچنے کے بعد ہم بہت حد تک محفوظ ہو سکتے تھے۔ لیکن میرٹھ میں ہمارے لئے زیادہ خطرہ تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم اگر ویگن کو لے کر اس وقت دلی کی طرف چل پڑتے ہیں تو راستے میں ہی صبح ہو جائے گی اور اگر کسی جگہ کوئی فوجی چیک پوسٹ ہوئی جس کا ہونا یقینی نظر آ رہا ہے تو ہم پکڑ لئے جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ سارا دن میرٹھ کے کسی ہوٹل میں گزارا جائے اور اسی جگہ اپنی فوجی وردیاں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔"

ہم نے فوجی سٹیشن ویگن وہیں ایک طرف درختوں میں کھڑی کر دی اور جس طرف کافی روشنیاں تھیں اس طرف چل پڑے۔ وہاں گراؤنڈ میں کوئی نمائش لگی ہوئی تھی۔ نمائش میں لوگ نہیں تھے مگر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ میرٹھ شہر کا ماڈرن علاقہ تھا۔

ہمیں کسی ہوٹل کی تلاش تھی۔ صبح کا ہلکا ہلکا اجالا آسمان پر نمودار ہونے لگا تھا۔ ایک چوک میں سے گزرے تو ایک سپاہی نے ہمیں دیکھا اور سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا۔ وہ رات کی ڈیوٹی پر ہوگا۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے ہمیں سلیوٹ کیا۔ ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اوپر کر کے سلیوٹ کا جواب دیا۔ اگلے چوک میں ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ہاتھ دیا تو ٹیکسی رک گئی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"فلیٹی ہوٹل چلو"

مجھے اتنا معلوم تھا کہ فلیٹی ہوٹل قریب قریب انڈیا کے ہر بڑے شہر میں ہوتا ہے۔ ڈرائیو نے کہا۔

"سر! فلیٹی ہوٹل تو بند ہو چکا ہے۔ آپ انڈیا میں دیر بعد آئے ہیں شاید؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم فوجی ٹریننگ کے واسطے ماسکو گئے ہوئے تھے۔ چلو کسی اور اچھے سے ہوٹل میں لے چلو۔"

وہ ہمیں رائل ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل بھی فلیٹی ہوٹل کی طرح کا تھا۔ میں نے لابی کے کاؤنٹر پر اپنا اور کمانڈر شیروان کا ہندو نام لکھوایا اور ناگ پور چھاؤنی کا غلط سلط پتہ لکھوا دیا۔ نہ پیشگی رقم ہوٹل والے نے ہم سے طلب کی نہ میں نے اس سے ایڈوانس ادائیگی کے بارے میں کوئی بات کی۔ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے آیا جب وہ چلا گیا تو میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں اس فوجی وردی سے نجات حاصل کرنی ہے۔ میرٹھ شہر میں پرانے کپڑوں کا لنڈا بازار ضرور ہوگا۔ میں وہاں سے سویلین کپڑے خرید کر لے آوں گا"

ہم نے ہوٹل میں اپنے وہ ہندو نام نہیں لکھوائے تھے۔ جو انبالہ ایئرپورٹ والے ملٹری ونگ کی ملٹری پولیس کو لکھوائے تھے اور جن ناموں سے ہوائی جہاز میں ہماری سیٹیں بک ہوئی تھیں۔ دن نکل آیا تھا ہم نے باری باری غسل کیا۔ پھر ناشتہ منگوا کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد میں میرٹھ کے لنڈے بازار کی تلاش میں نکل گیا۔ میں بھارتی فوج کے

صوبیدار میجر کی وردی میں تھا۔ پوچھتا پوچھتا میں ایک بازار میں آگیا۔ جہاں پرانے گرم کپڑے فروخت ہو رہے تھے۔ یہاں سے میں نے اپنے اور کمانڈر شیروان کے ناپ کی دو پتلونیں دو پرانی گرم جرسیاں اور گرم مفلر خریدے اور ہوٹل واپس آگیا۔ ہم نے وردیاں اتاردیں اور سویلین کپڑے پہن لئے اس کے بعد ریلوے سٹیشن پر فون کر کے دلی جانے والی گاڑی کا پتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی رات کے سوا بارہ بجے دلی جائے گی۔ ہم نے اسی گاڑی میں دلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں نے کمانڈر شیروان سے کہا کہ وہ آرام کرلے۔ وہ سو گیا میں جاگتا رہا۔ تین گھنٹے کی نیند کے بعد کمانڈو جاگا تو پھر میں سو گیا۔ اس طرح دن گزر گیا شام آگئی۔ ہم ہوٹل کے کمرے میں ہی رہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم رات کے گیارہ بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہم ہوٹل سے نکل پڑے۔ سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں دس پندرہ منٹ میں سٹیشن پر پہنچا دیا۔ ہم نے پرانے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے۔ گلے میں مفلر ڈال رکھے تھے۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ میرٹھ کے ریلوے سٹیشن پر ملٹری پولیس تو نظر نہ آئی لیکن ریلوے پولیس موجود تھی۔ مگر انہوں نے بھی ہمیں کوئی اہمیت نہ دی۔

یہ کوئی میل ٹرین تھی اور امرتسر سے آرہی تھی۔ پورے بارہ بجے رات ٹرین آگئی۔ ہم نے دلی تک کے دو سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لے لئے تھے۔ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ اس لئے لئے تھے کہ فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں رات کے وقت کوئی ٹی ٹی وغیرہ نہیں آتا۔ پولیس سے آمنا سامنا ہونے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں کچھ دوسرے مسافر بھی تھے جن میں تین سو رہے تھے۔ ایک سکھ مسافر میرٹھ ہی سے سوار ہوا تھا اور برتھ پر قلی کی مدد سے اپنا بستر لگوا رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹرین دلی کی طرف روانہ ہوگئی۔ میرٹھ سے دلی زیادہ دور نہیں ہے۔ درمیان میں غازی آباد کا بڑا سٹیشن آیا جو دلی کے مضافات میں ہی واقع ہے۔

ابھی رات کافی گہری تھی کہ ہم دلی پہنچ گئے۔

اپنے آدمی گل خان کے گھر کا مجھے پتہ معلوم تھا۔ کمانڈر شیروان بھی دو ایک بار بھیس بدل کر اپنی کسی کمانڈو مہم کے سلسلے میں گل خان کے گھر آ چکا تھا۔ ہم ایک رکشے میں سوار ہو کر گل خان کے محلے میں پہنچ گئے۔ گل خان کا نام آپ کو یاد ہو گا میں نے فرضی رکھا ہوا ہے۔ اس کشمیری مجاہد کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ گل خان کا مکان علاقے کی ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ اس وقت وہ سو رہا تھا۔ گل خان کی بڑے بازار میں دکان تھی۔ وہ اکیلا مجرد زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر اکیلے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بال بچہ ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ انہیں کسی وقت ہنگامی حالت میں فرار بھی ہونا پڑ جاتا ہے۔ گل خان نے ہمیں دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ باری باری ہم سے گلے ملا اور بیٹھک میں لے گیا کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان تمہاری گرفتاری کی خبر ہمیں یہاں مل گئی تھی۔ میں سخت پریشان تھا۔ پیچھے کئی بار رات کو وائرلیس پر رابطہ پیدا کر چکا ہوں۔ وہاں سے یہی خبر ملتی کہ کمانڈر شیروان کو ملٹری پولیس جموں لے گئی ہے۔ پھر یہ خبر ملی کہ کمانڈو امرتسر جیل میں ہے اور اپنے دو کمانڈو لیڈر کو فرار کروانے جا چکے ہیں۔ اب تم دونوں کو دیکھ کر بے حد تسلی ہوئی ہے۔ مجھے ویسے بھی ایک ضروری مشن کے سلسلے میں آپ لوگوں سے ملاقات کرنی تھی۔ میں خود سری نگر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"آخر وہ مشن کیا ہے؟"

گل خان بولا۔

"ابھی آپ لوگ آرام کریں۔ صبح بات کریں گے۔"

ہم وہیں دری پر لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ کیونکہ دلی میں پنجاب کی طرح کافی سردی تھی۔ صبح گل خان نے ہمیں اٹھایا اور کمانڈر شیروان کے چہرے پر زخم کے کھرنڈ دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ ٹارچر کے نشان ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں اس کے لئے دوائی لاتا ہوں ناشتہ میں نے باورچی خانے میں ہی لگا دیا ہے۔ اتنی دیر میں آپ لوگ ناشتہ کر لیں"

ہم باورچی خانے میں آ گئے اور گل خان مکان سے نکل گیا۔ جب واپس آیا تو ہم ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھک میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گل خان کچھ اینٹی بائیٹک گولیاں اور زخموں پر لگانے کے واسطے مرہم لایا تھا۔ اس نے کمانڈر شیروان کے زخموں کے کھرنڈوں پر مرہم لگائی اینٹی بائیٹک کی دو گولیاں کھلائیں اور کہنے لگا۔

"آپ لوگوں کو بتانا بیکار ہے مگر پھر بھی میں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ دن کے وقت یہاں سے باہر نہ نکلیں رات کے وقت مجھے بتا کر باہر جا سکتے ہیں۔"

کمانڈر شیروان نے اس سے پوچھا۔

"تم کسی مشن کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ کیا مشن ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"میں چائے بنا کر لے آؤں۔ چائے پیتے ہوئے بات کروں گا۔ ویسے یہ مشن بے حد اہمیت کا حامل ہے۔"

وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ جس مشن کی گل خان بات کرنے والا ہے وہ کون سا مشن ہو سکتا ہے۔ گل خان اپنے لئے اور ہمارے لئے بھی چائے کی چینک بھر کے لے آیا۔ اس نے تین پیالیوں میں چائے ڈالی اور بولا۔

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ مشن کیا ہے جس کی خاطر میں آپ کے پاس سری نگر کے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنے والا تھا۔"

ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

گل خان نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے خاص خفیہ ذرائع سے خبر ملی ہے کہ بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش میں اپنا کوئی حریت پرست مجاہد پولیس کی حراست میں ایلورا جیل کے ٹارچر سیل میں گزشتہ ایک مہینے سے پولیس کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ مجاہد وہاں کیسے پہنچ گیا۔ اسے وہاں پاکستانی کمانڈو کا الزام لگا کر رکھا گیا ہے اور اس پر وحشیانہ تشدد کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ ہم اس کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں ہیں۔ صرف اتنا ہی سراغ ملا ہے کہ جب اس پاکستانی کمانڈو یا کشمیری مجاہد کو آندھرا پردیش کی پولیس نے گرفتار کیا تو وہ سادھو کے بھیس میں تھا۔ اگر یہ شخص واقعی کشمیری مجاہد یا پاکستانی کمانڈو ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اسے بھارتی درندہ صفت پولیس کے تشدد سے بچائیں۔ کہتے ہیں کہ جب اس مجاہد پر تشدد کی انتہا ہو جاتی ہے تو وہ درد سے چیخنے کی بجائے پاکستان زندہ باد آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیتا ہے اور نعرے لگاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

میں اور کمانڈر شیروان بڑے غور سے سن رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہماری کمانڈو پارٹی کا کوئی مجاہد نہ تو آندھرا پردیش کی طرف کبھی گیا ہے اور نہ وہاں قید میں ہے۔"

گل خان بولا۔

"تو پھر یہ آزادی کشمیر' پاکستان اور اسلام کا غازی کون ہو سکتا ہے بہرحال وہ جو کوئی

بھی ہے مسلمان ہے مجاہد ہے۔ اس پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگا کر آندھرا پردیش کی پولیس اس کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنا رہی ہے۔ ہماری خفیہ اطلاع کے مطابق اس مرد مومن نے اپنے نام کے سوا بھارتی پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ افسوس کہ ہمیں اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ بڑی مصدقہ رپورٹ ہے کہ ایلورا کے ساحلی شہر سے تین چار میل دور سمندری جزیرے میں جو خطرناک اور عمر قید بھگتنے والوں قیدیوں کے لئے جیل بنائی گئی ہے وہاں ایک کال کوٹھڑی میں یہ مجاہد بند ہے اور گزشتہ ایک ماہ سے سخت اذیتیں برداشت کر رہا ہے اور اسلام زندہ باد پاکستان زندہ باد اور آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہا ہے۔"

میں نے گل خان سے پوچھا۔

"کیا یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کشمیری ہے' پنجابی ہے یا پاکستانی ہے؟"

گل خان نے جواب میں کہا۔

"اس بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ ایلورا کے ساحلی شہر سے چار میل دور سمندر کے اندر ایک چھوٹے سے جزیرے میں جو جیل خانہ ہے وہاں کسی شہری کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ قیدیوں سے ان کے رشتے دار بھی ملاقات نہیں کر سکتے۔ جزیرے کے اردگرد ساحلی پولیس کے سٹیمر ہر وقت چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ذرا سے شک پر وہ مشین گنوں کی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ اس جیل خانے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہوسکا۔ جس سمندر میں یہ جیل خانہ ہے اس میں پولیس نے سینکڑوں کی تعداد میں شارک مچھلیاں چھوڑ رکھی ہیں۔ اگر کوئی انسان سمندر میں اترے تو شارک مچھلیاں اس کی بو پر فوراً وہاں پہنچ کر اس بدقسمت کی تکا بوٹی کر دیتی ہیں۔ یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے آپ لوگ یہ بتائیے کہ کیا آپ اس مشن پر جانے کے لئے تیار ہیں؟"

میں نے کمانڈر شیروان کی طرف دیکھا۔ اس نے گل خان سے کہا۔

"گل خان! آزادی کشمیر کے مجاہد' پاکستان کے شیدائی اور اسلام کے غازی اس شیر

دل مجاہد کو وہاں سے نکالنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اس مشن کو اپنا دینی فرض سمجھ کر پورا کریں گے۔"

گل خان نے میری طرف دیکھا۔

"کیا تم بھی تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں دل و جان سے تیار ہوں۔ لیکن میں اس مشن پر اکیلا جانا زیادہ پسند کروں گا۔ کمانڈر شیروان کو آرام کی بھی ضرورت ہے اور پیچھے کشمیر کے محاذ پر بھی اس کی ضرورت ہے"

کمانڈر شیروان نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک کشمیر بھارتی تسلط سے آزاد نہیں ہو جاتا اور کشمیری عوام اپنا حق خود ارادیت حاصل نہیں کر لیتے' آرام ہم پر حرام ہے میں اس مشن پر ضرور جاؤں گا"۔

حقیقت یہ ہے کہ میں کمانڈر شیروان کو اس خطرناک مشن پر ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ انڈیا کی ملٹری انٹیلی جینس نے امرتسر کے قلعے میں اس پر اس قدر تشدد کیا تھا کہ کمانڈر شیروان کو کم از کم ایک ماہ تک علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک اور طرح سے کمانڈر شیروان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو شیروان! اس مشن پر ویسے بھی دو کمانڈوز کا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ ایک آدمی تو ہنگامی صورت میں کسی بھی طرح اپنا بچاؤ کر سکتا ہے لیکن دو آدمیوں کے لئے مشکل پڑ سکتی ہے۔ آپ ہمارے کمانڈو ہیں۔ ہم آپ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ یہاں سے واپس سری نگر پہنچ کر حریت پرست کمانڈوز کی قیادت سنبھالیں۔ وہاں آپ کی اشد ضرورت ہے۔"

کمانڈر شیروان کسی طرح نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب گل خان نے بھی اسے سمجھایا تو وہ بادل نخواستہ سری نگر واپس جانے پر راضی ہو گیا۔

ہمارا اب سب سے پہلا مشن کمانڈر شیروان کو دلی سے نکال کر سری نگر پہنچانا تھا۔

گل خان نے اپنے ایک خاص آدمی کو تیار کر لیا۔ ایک رات کمانڈر شیروان کا سادھوؤں والا حلیہ بنا کر اس خاص آدمی کے ساتھ دلی سے بذریعہ ٹرین جموں توی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد میں اور گل خان سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ کہ آندھرا پردیش کا یہ شہر جہاں مجھے جانا ہے کس طرف واقع ہے"

گل خان کہنے لگا۔

"یہ سارا علاقہ حیدر آباد دکن کا علاقہ ہے جہاں نظام حیدر آباد کی حکومت تھی اور جو ہندوستان کی سب سے بڑی مسلمان ریاست تھی۔ نظام حیدر آباد نے قیام پاکستان کے وقت پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا۔ مگر قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارتی فوج نے حیدر آباد دکن کی مسلم ریاست پر چڑھائی کر دی۔ دکن کے بہادر اور سرفروش رضاکاروں نے ہر محاذ پر بھارتی فوج کا بے جگری سے مقابلہ کیا مگر ان کے وسائل محدود تھے۔ ان کے پاس وافر اسلحہ اور توپ خانہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ بھارت نے حیدر آباد کی ریاست پر قبضہ کر لیا اور ہزاروں مسلمانوں نے دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ بہرحال اب اس صوبے کا نام آندھرا پردیش ہے۔ یہاں کے لوگ بڑی خوبصورت اردو زبان کے ساتھ ساتھ تلگو زبان بھی بولتے ہیں۔ تمہیں دلی سے حیدر آباد (دکن) جانا ہو گا۔ وہاں سے تم وجے واڑہ جاؤ گے۔ وجے واڑہ سے نیلور شہر کے سٹیشن پر اتر جاؤ گے۔ یہاں ایک دریا سمندر میں گرتا ہے۔ دریا کے ڈیلٹے پر ایلورا نام کا چھوٹا سا شہر آباد ہے۔ اس شہر کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے جہاں سے مسافر بردار اور سامان سے لدے ہوئے سمندری جہاز اوپر ماشولی پٹم' کاکی ناڈا اور وشاگاپٹنم کی طرف اور نیچے مدراس کی جانب جاتے ہیں۔ یہ خلیج بنگال کا سمندر ہے۔ ایلورا کی چھوٹی سی بندرگا سے مشرق کی طرف سمندر میں چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے میں صرف ایک ہی بلند پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی کے اوپر وہ جیل خانہ ہے جس کی ایک کال کوٹھڑی میں ہمارا گمنام مجاہد یا کمانڈو قید و بند میں رہ کر تشدد کی اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔

مجھ تک جتنی خفیہ اطلاعات پہنچی ہیں وہ میں نے تمہیں بیان کر دی ہیں۔ باقی آگے ہمارا ایک آدمی تمہاری راہ نمائی کرے گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ اپنا آدمی کیا دلی سے میرے ساتھ جائے گا؟"

گل خان نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ آدمی تمہیں حیدر آباد دکن میں ملے گا۔ تمہیں اس کا ایڈریس دے دیا جائے گا اور اپنی شناخت کے لئے کوڈ الفاظ بھی بتا دیئے جائیں گے۔ ٹھہرو میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔"

گل خان ایک ٹرنک میں سے کاپی نکال کر لے آیا۔ کاپی میں پاسپورٹ سائز کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ گل خان نے تصویر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا وہ خفیہ آدمی ہے جو تمہیں حیدر آباد کے ایک محلے میں ملے گا۔ تمہیں اس محلے کا پورا پتہ بتادیا جائے گا۔ میں تمہیں اس آدمی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ وہ بھی تمہیں اپنا نام نہیں بتائے گا۔ وہ تم سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہو گا۔ مگر تمہاری پوری پوری راہ نمائی کرے گا اور تمہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت پڑے وہ تمہیں مہیا کر دے گا۔ اس شخص کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ تمہیں کچھ بتانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اس خاص آدمی کا اصلی نام میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ وہ نام بتاؤں گا جس نام سے وہ شہر حیدر آباد دکن میں رہ رہا ہے۔ وہ تم سے بھی تمہارا نام نہیں پوچھے گا۔ اس شخص تک اپنے خفیہ وسائل کے ذریعے تمہارا حلیہ اور تمہارے بارے میں ساری معلومات پہنچا دی جائیں گی۔"

میرے ہاتھ میں اس شخص کی تصویر تھی جس سے حیدر آباد دکن میں جا کر مجھے ملاقات کرنی تھی اور اس کے ذریعے آگے ایلورا کے جزیرے والی بھارت کی خطرناک ترین جیل اور اپنے گمنام کمانڈو مجاہد کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے اسے بھارتی قبضے سے آزاد کرانا تھا۔ تصویر ایک درمیانی عمر کے آدمی کی تھی جس کی گھنی

مونچھیں تھیں۔ ڈاڑھی نہیں تھی۔ اچکن پہنی ہوئی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ سر پر کانگرسی ٹوپی تھی۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"کیا یہ ہندو کانگرسی بن کر وہاں رہتا ہے؟"

"ہاں" گل خان نے جواب دیا۔ "یہ وہاں اپنے محلے کی کانگرس کمیٹی کا ممبر بھی ہے"

پھر اس نے مجھے اس کا ہندو نام اور اس کے محلے کا ایڈریس زبانی بھی بتایا اور لکھ کر بھی دے دیا۔ میں نے یہ ایڈریس والا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔

اس کے بعد میں نے آندھرا پردیش میں کسی سنگین جیل میں قید اور بھارتی خفیہ انٹیلی جنیس کے تشدد اور ٹارچر کا نشانہ بنتے ہوئے اسلام کے غازی' پاکستان کے شیدائی اور آزادی کشمیر کے مجاہد اس گمنام کمانڈو کو وہاں سے فرار کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آندھرا پردیش میں ان دنوں گرمیوں کا موسم تھا۔ وہاں نومبر دسمبر میں بھی سردی برائے نام صرف رات کو پڑتی تھی۔ میں نے ایک مٹیالے رنگ کی موٹے کھدر کی جیکٹ بنوائی۔ پتلون بھی اسی کلر کی خریدلی۔ جوتے میرے ٹھیک ٹھاک تھے۔ ایک کھدر کا تھیلا لے لیا۔ اس قسم کا تھیلا سیاسی کارکن عام طور پر اپنے کاندھے سے لٹکائے رکھتے تھے۔ اس میں میں نے ایک جوڑا کھدر کا کرتا پاجامہ اور تولیہ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ رکھ لیا۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی مگر اپنے آپ کو ایک نارمل مسافر ظاہر کرنے کی خاطر یہ چیزیں ضروری تھیں۔ گل خان نے مجھے کچھ انڈین کرنسی دے دی۔ دلی سے نیلور تک کا تھرڈ کلاس کا ریلوے ٹکٹ بھی لا کر دے دیا۔

میرے اور کمانڈر شیروان کے پاس جو دو آٹومیٹک پستول تھے ان میں سے ایک کمانڈو شیروان چھپا کر اپنے ساتھ ہی سری نگر لے گیا تھا۔ ایک میرے پاس تھا۔ میگزین بھی تھا۔ گل خان نے کہا۔

"یہ پستول ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں۔ یہ تم یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ حیدر آباد میں ہمارا آدمی تمہیں جس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہو گی تمہیں مہیا کر دے گا۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے اور وہ آج بھی پاکستان سے والہانہ پیار کرتے ہیں اور

کشمیریوں کو حق خود ارادی دلانے کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں مگر بھارتی حکومت نے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی طرح دکن کے مسلمانوں کے پاؤں میں بھی غلامی اور جبرو استبداد کی زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ بہرحال وہاں پہنچ کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کا رشتہ کس قدر مضبوط اور ناقابل شکست رشتہ ہوتا ہے اور یہ رنگ نسل اور قومیت سے بلند تر ہوتا ہے۔"

میں نے اپنا آٹومیٹک پستول گل خان کو دے دیا۔ اس وقت تک میرے ڈاڑھی مونچھ نہیں تھی۔ میں نے شیو کروادی ہوئی تھی۔ صرف سر کے بال تھوڑے تھوڑے لمبے تھے۔ میں نے یہی حلیہ رہنے دیا۔

گل خان رات کے وقت میرا دلی سے نیلور تک کا ریل کا ٹکٹ لایا تھا۔ گاڑی منہ اندھیرے چھوٹتی تھی۔ گل خان نے مجھے ایک گھنٹہ پہلے جگادیا۔ میں نے غسل کرنے کے بعد وضو کیا۔ نماز فجر ادا کی اور خدا کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگی موٹے کھدر کی جیکٹ اور پتلون پہن کر کھدر کا تھیلا اپنے کاندھے سے لٹکالیا۔ میرے پاس ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ گل خان نے مجھے چاقو ساتھ رکھنے سے منع کیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم اس وقت کانگرسی ورکر لگتے ہو۔ یہاں سے تم کانگرسی ہندو بن کر اپنا سفر شروع کرو گے۔ اپنا کوئی ہندو نام سوچ کر رکھ لینا۔ اور کوڈ کے الفاظ اچھی طرح یاد رکھنا۔ ان الفاظ کے بغیر اپنا آدمی تم کو پہچاننے سے انکار کر دے گا۔"

میں نے کوڈ کے الفاظ گل خان کو دہرا کر سنائے۔ یہ دو جملے تھے۔ ایک جملہ مجھے بولنا تھا۔ جس کے جواب میں ایک جملہ اپنے حیدر آباد والے جاسوس مجاہد نے بولنا تھا۔ اس کے جواب میں پھر مجھے ایک کوڈ کا جملہ ادا کرنا تھا۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"سر پر کانگرسی ٹوپی اور ماتھے پر تلک لگانے کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

وہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ کانگرسی ورکر تلک نہیں بھی لگاتے۔ اگر کہیں ضرورت

محسوس ہوئی تو اپنے آپ کو کمیونسٹ بھی ظاہر کر دینا۔ آندھرا پردیش میں کمیونسٹ پارٹی کا بھی زور ہے اور بھارت میں کمیونسٹ پارٹی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

میں نے گل خان سے ہاتھ ملایا۔ اس نے میرے مشن کی کامیابی کے لئے دعا کی اور کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ایلورا جزیرے کی سنگین جیل میں قید وبند اور تشدد کی اذیتیں برداشت کرنے والے گمنام کمانڈو اور اسلام کے اس مجاہد کو ضرور رہا کرالو گے جس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون مسلمان مجاہد ہے اور بھارتیوں کی قید میں کیسے پھنس گیا۔"

میں نے کہا۔

"میں انشاء اللہ پوری کوشش کروں گا کہ اس مرد غازی کو کافروں کی قید سے نکال کر جہاں وہ جانا چاہے اسے وہاں پہنچادوں۔ خدا حافظ!"

دلی میں ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔

رات کے پچھلے پہر ستارے آسمان پر جھلملا رہے تھے۔ مگر دلی بہت بڑا شہر تھا۔ گل خان کے اندرون شہر والے محلے سے نکلا تو کشادہ بازاروں میں بتیاں خوب روشن تھیں۔ میں نے پیدل چلنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ رات کو گشت کرنے والی پولیس سے کہیں بھی آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ جو پہلا خالی رکشا ملا اسی میں بیٹھ کر دلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ دلی سے نیلورا وایا حیدر آباد ایسا روٹ تھا کہ جس روٹ پر بھارت کے بڑے بڑے اہم شہر تھے اور ان شہروں کے مسافر پلیٹ فارم پر اپنے کنبوں کے ساتھ بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ جو لکھنؤ کانپور سے آرہی تھی۔ میں نے ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر چائے کا ایک کپ پیا۔ ناشتہ میں گل خان کے ہاں سے کر کے آیا تھا۔ دلی میں سردی تھی۔ مگر موٹے کھدر کی جیکٹ سے سردی کا کافی بچاؤ ہو گیا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا اور سگریٹ سلگا کر ایک طرف بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرین آئی مسافروں نے اس کے ڈبوں پر بلہ بول دیا۔ میں اکیلا تھا۔ کوئی سامان بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ ایک ڈبے میں مجھے بھی جگہ مل گئی۔ مسافروں میں پنجابی ہندو سکھ بھی تھے جنوبی ہند کے کالے کالے مدراسی تامل بھی تھے۔ طرح طرح کی زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ میں کونے میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا باہر پلیٹ فارم کی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ دلی سے نیلور تک کا سفر بھی شیطان کی آنت کی طرح طویل تھا۔ خدا جانے کتنے سٹیشن آئے۔ کتنے شہر آئے۔ آب وہوا بدل گئی۔ زبان بدل گئی۔ بڑے بڑے چند ایک شہر یاد رہ گئے ہیں۔ وہی آپ کو بتاتا ہوں یہ ٹرین دلی سے وایا جھانسی نیلور جا رہی تھی۔ جھانسی سے وہ دلی بمبئی لائن کو چھوڑ کر وہ نرسیما پور اور ناگ پور والی لائن پر ہو گئی۔ نرسیما پور سے ناگ پور ناگ پور سے وادھا سے چندرا پور' وہاں سے ورنگل اور ورنگل سے حیدر آباد پہنچ گئی۔ یہ سفر پورے ایک دن اور ایک رات اور پھر ایک دن میں طے ہوا۔ حیدر آباد ٹرین پہنچی تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس مسلم ریاست کے آثار سٹیشن کی طرز تعمیر اور وہاں کے لوگوں کے پہناوے سے نمایاں تھے یہاں اچکنیں اور ترکی ٹوپیاں نظر آئیں تو دل کو خوشی ہوئی۔ مگر جب یہ خیال آیا کہ برصغیر کی اس سب سے بڑی مسلمان ریاست پر انڈیا کی حکومت نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور یہاں مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا گیا تھا تو دل اداس پڑ گیا۔ مجھے یہاں اترنا تھا اور اپنے آدمی سے ملاقات کرنی تھی۔

میرا ٹکٹ نیلور تک کا تھا۔ میں حیدر آباد دکن کے سٹیشن پر اتر گیا۔ سٹیشن سے باہر نکل کر ایک موٹر رکشا والے کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں مجھے اپنے آدمی سے ملنا تھا۔ رکشا شہر کے خوبصورت کشادہ بازاروں میں سے گزرنے لگا۔ دور سے میں نے چار مینار کی عمارت دیکھی۔ رکشا دوسری طرف سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کہ رکشا کس طرف گیا۔ رکشا ایک خاص جگہ پر جا کر رک گیا۔ یہی وہ علاقہ تھا جس کا پتہ مجھے گل خان نے لکھوایا اور یاد بھی کرایا تھا۔ اتنا سمجھ لیں کہ یہ کوئی ماڈرن علاقہ نہیں تھا۔ درمیانے درجے کی آبادی تھی۔ خوشنما مکان بھی تھے اور ٹین کی چھتوں والے مکان

بھی تھے۔ املی تاڑ اور ناریل کے درخت جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ مسلمان اپنی اچکن اور چوڑے چوڑے پاجاموں سے صاف پہچانے جاتے تھے جب کہ ہندو صرف بنیان اور تہمد باندھے ہوئے تھے۔ تہمد بھی انہوں نے نیچے سے اٹھا کر گھٹنوں تک باندھا ہوا تھا۔ ان کی اکثریت پاؤں سے ننگی تھی۔ شلوار قمیض اور برقعوں والی مسلمان عورتیں بھی دکانوں پر نظر آ رہی تھیں اور ساڑھیوں والی ہندو عورتیں بھی چل پھر رہی تھیں۔ یہاں کی زبان اردو بھی تھی اور تلیگو زبان بھی بولی جا رہی تھی۔ تامل لوگ بھی تھے مگر اکثریت تلیگو بولنے والوں کی تھی۔ ایک مسجد کے اونچے مینار دکھائی دیئے یہ ایک نشانی تھی جو مجھے بتائی گئی تھی۔ اس مسجد کے آگے ایک بازار تھا جس کی ایک دکان میں باہر ایک بورڈ لگا تھا۔ بورڈ پر کیا لکھا تھا؟ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

دکان کے اندر وہی گھنی مونچھوں والا آدمی جس کی گل خان نے مجھے دلی میں تصویر دکھائی تھی تخت پوش پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے حیدر آبادی اچکن پہنی ہوئی تھی جس کے بٹن گرمی کے موسم میں بھی گلے تک بند کئے ہوئے تھے۔ سر پر کانگریسی ٹوپی تھی۔ تین آدمی تخت پوش پر اس کے سامنے بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی آداب کہہ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ گل خان نے اپنے خفیہ پیغام کے ذریعے اسے بھی میرا حلیہ بتا دیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے مگر اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اتنا ضرور اس نے کیا کہ مجھ سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے آدمیوں کو مختصر سی بات کرنے کے بعد ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ جب سب لوگ چلے گئے اور دکان میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ رہا تو اس نے صندوقچی میں سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ مجھے بیڑی پیش کی۔

"آپ شوق کریں گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں شکریہ"

"آپ تمباکو نہیں پیتے؟؟"

میں نے کہا۔

"میں سگریٹ ضرور پیتا ہوں مگر بیڑی بڑی سخت ہوتی ہے"

اس نے خود ایک بیڑی سلگالی اور مجھ سے پوچھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ کیسے تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کوڈ کا جملہ بولا۔

"دکن میں اسلام کے نام پر مسلمانوں کا بہت خون بہا ہے"

اس نے جواب میں کہا۔

"دکن میں بارش بہت ہوتی ہے۔"

میں نے اس کے جواب میں خفیہ کوڈ کا جملہ بولا۔

"رات دریائے کاویری میں سیلاب کا منظر تھا"

ہم دونوں کی شناخت ہو چکی تھی۔ اس نے صندوقچی میں سے ایک کاپی نکالی۔ قلم سے کاپی کے ایک صفحے پر کچھ لکھا۔ ورق پھاڑ کر تہہ کیا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ لے جائیں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا کام ہو جائے گا"

میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ جیب میں ڈالا اور آداب بجالا کر دکان سے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے کاغذ پر کوئی خاص پیغام لکھا ہے۔ میں بازار میں سے گزر کر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ یہاں ایک درخت کے نیچے کاندھے سے تھیلا اتار کر یوں بیٹھ گیا جیسے ذرا آرام لینے کے لئے بیٹھا ہوں۔ وہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ میں نے جیب سے کاغذ نکال کر پڑھا اس میں لکھا تھا۔

"چار مینار سے سات نمبر بس پکڑو اور پرانے قبرستان کے سٹاپ پر اتر جاؤ۔ قبرستان کے شمال میں بیگم کا مقبرہ ہے وہاں میرا انتظار کرو"

ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ سورج مغرب میں غروب نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک رکشا لیا اور چار مینار کے بس سٹاپ پر اتر گیا۔ دو تین بسیں آکر نکل گئیں۔ آخر سات نمبر

کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہوگیا اور کنڈیکٹر سے کہا کہ پرانے قبرستان کا سٹاپ آئے تو بتا دینا۔ بس شہر کے مختلف بازاروں میں سے گزرتی ہوئی ایک کم آبادی والے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں کھیت' اور درختوں کے ذخیرے تھے۔ بس کی رفتار کم ہونے لگی۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

"پرانا قبرستان"

میں بس سے اتر گیا۔ بس چلی گئی میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی ایک طرف چھوٹی سی مسجد کے مینار دکھائی دیئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ یہ پرانے قبرستان کی جنازگاہ تھی۔ قبرستان میں کچی پکی قبریں تھیں۔ میں دل ہی دل میں فاتحہ پڑھتا قبروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ میری نگاہیں مقبرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ قبرستان کی حدود ختم ہو گئی۔ ایک طرف گھنے درختوں میں چھوٹی سی بارہ دری نظر پڑی۔ میں وہاں آگیا۔ بارہ دری میں ایک قبر بنی ہوئی تھی جس پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ کتبے پر آیات شریفہ کندہ تھیں اور جس بیگم صاحبہ کی یہ قبر تھی اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

میں مقبرے کی بارہ دری میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دو زانو ہو کر فاتحہ پڑھ کر مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا اور پھر اپنے خاص آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران سورج غروب ہوگیا اور شام کی سیاہی پھیلنا شروع ہو گئی۔ فضا حبس آلود تھی۔ ہوا جیسے بند تھی۔ میں بارہ دری سے اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے سے کچھ ہوا لگنے لگی۔ اتنے میں مجھے قبرستان کی طرف سے ایک آدمی بارہ دری کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں بارہ دری کی اوٹ میں ہوگیا۔ آدمی قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ اپنا آدمی تھا۔ یعنی وہی آدمی جس نے مجھے رقعہ لکھ کر یہاں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ میرے پاس آکر بولا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ"

وہ درختوں کے ایک ذخیرے میں داخل ہوگیا۔ ہم درختوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ذخیرے کے آخری کنارے پر ٹین کی چھت والا ایک کیبن سا بنا ہوا تھا۔ دیواریں پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھیں پتھروں پر جنگلی بیلیں چڑھی

ہوئی تھیں۔ وہ کیبن کے اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اس نے موم بتی روشن کر دی اور کیبن کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ اندر حبس تھا فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس نے چٹائی پر مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور جیب سے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔

"گل خان نے مجھے تمہارے مشن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ ایلور کے سمندری جزیرے کی جیل میں ایک مسلمان مجاہد قید وبند کی صعوبتیں اور خفیہ پولیس کی اذیتیں سہہ رہا ہے اور اس پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس مجاہد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا۔

"پہلے یہ بتائیں کہ اس جزیرے کا نام ایلورا ہے یا ایلور"

وہ بولا۔

"اس کا نام ایلور ہے۔ صرف ایلور۔ ایلورا اور اجنٹا دو غار ہیں جو اورنگ آباد کے ضلع میں واقع ہیں۔ ان کا ایلور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایلور نیلور سے کچھ فاصلے پر آندھرا پردیش کا وہ ساحلی شہر ہے جہاں دریا سمندر میں گرتا ہے۔ وہاں سے سمندر میں چار میل کے فاصلے پر وہ چھوٹا سا ویران جزیرہ ہے جہاں جیل خانہ ہے۔ اس جزیرے میں اور کوئی آبادی نہیں ہے۔ صرف جیل کے عملے کے لوگ چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ جیل کے وارڈن اور افسر وغیرہ رات کو سٹیمر کے ذریعے ایلور شہر میں آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کیا ایلور میں اپنا کوئی ایسا آدمی مجھے مل سکے گا جو میرے مشن کے سلسلے میں تھوڑا سا گائیڈ کر سکے اور ضرورت پڑنے پر میری تھوڑی بہت مدد بھی کر سکے؟"

اس آدمی نے کہا۔

"وہاں اپنا ایک آدمی موجود ہے میں نے تمہیں اس آدمی کے بارے میں بتانے کے

واسطے ہی یہاں بلایا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ آدمی کشمیری مجاہد ہے؟"

اس نے کہا۔

"کشمیری مجاہد اپنے محاذ پر بھارتی فوجیوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں انہیں اتنی فرصت نہیں ہے کہ یہاں آکر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ ایلور میں تم جس آدمی سے ملو گے وہ آندھرا پردیش کا مسلمان ہے۔ جیسے میں یہاں کا رہنے والا مسلمان ہوں لیکن حیدر آباد میں ہندو کے نام سے اسلام کی سربلندی کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کر رہا ہوں۔ ہمارے درمیان اسلام کا رشتہ ہی سب سے بڑا رشتہ ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان دنیا کے جس کونے میں بھی ہو گا وہ اپنے مسلمان بھائی کی ضرور مدد کرے گا۔ اور یہ تو جہاد کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کا معاملہ ہے جس کے لئے ہماری جان بھی حاضر ہے۔"

اس آدمی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ اسلام کا رشتہ ہمارا سب سے بڑا رشتہ ہے۔ اگر دنیا کے تمام مسلمان چھوٹے چھوٹے فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اسلام اور صرف اسلام کے پرچم تلے متحد ہو جائیں تو یقین کریں امت مسلمہ کی طاقت کا مقابلہ پھر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی نہیں کر سکیں گی۔

اپنے اس حیدر آبادی مجاہد نے مجھے اس خاص آدمی کا نام اور حلیہ بتایا جو ایلور کے ساحلی شہر میں رہ رہا تھا اور جس کے پاس مجھے جانا تھا۔ حیدر آبادی مجاہد نے کہا۔

"اپنا یہ غازی مسلمان کے نام سے یعنی اپنی اصلی حیثیت سے رہتا ہے۔ میری طرح وہاں اسے ہندو اور کانگرس کمیٹی کا رکن بن کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے خفیہ ذریعے سے اس کو تمہارے مشن کے بارے میں اطلاع پہنچا دوں گا۔"

اس کے بعد حیدر آبادی مجاہد نے مجھے اس شخص کا ایلور شہر میں پورا ایڈریس زبانی

بھی بتایا اور لکھ کر بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے کہا۔

"میرے پاس نیلور شہر تک ریل کا ٹکٹ موجود ہے۔ آگے ایلور کے بارے میں سنا ہے کہ وہ نیلور سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہاں پہنچ سکوں"

حیدر آبادی مجاہد کہنے لگا۔

"پھر بھی تم مجھ سے کچھ پیسے لے کر رکھ لو۔ ویسے تو ایلور شہر والا اپنا غازی تمہاری ہر طرح مدد کرے گا۔"

اس نے مجھے اچکن کی جیب میں سے انڈین کرنسی کے دس دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے جو میں نے شکریے کے ساتھ اپنے پاس رکھ لئے۔

"اب تم یہاں سے سیدھا حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر جاؤ گے۔ نیلور جانے والی مدراس میل تمہیں رات کے آٹھ بجے ملے گی۔ میں اب جاتا ہوں۔ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد تم بھی یہاں سے نکل جانا۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتا دو"

میں نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ"

حیدر آبادی مجاہد مجھ سے گلے لگ کر ملا اور بولا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے مشن میں کامیابی عطا فرمائے۔ ویسے ایلور کے جزیرے والی جیل سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہو سکا۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنے مسلمان بھائی کو جیل کی سلاخوں اور بھارتی درندوں کی ظالمانہ اذیتوں سے نجات دلا کر رہوں گا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے۔"

حیدر آبادی مجاہد نے میری پیشانی چوم لی۔

"جزاک اللہ! جزاک اللہ"

اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی جوشیلی آواز میں کہا۔

"پاکستان زندہ باد۔ آزادی کشمیر زندہ باد"

اور وہ تیزی سے کیبن میں سے نکل گیا۔ اس حیدر آبادی مجاہد کے سینے میں جذبہ اسلام اور جوش اسلام کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ یہی وہ جذبہ اور جوش ہے جس کی طاقت سے مسلمانوں نے روم کی طاقتور ترین سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور ان کے گھوڑے کفر کے بتوں کو روندتے ہوئے ہسپانیہ اور اس کے آگے جنوبی فرانس اور وی آنا کی سرحدوں تک پہنچ گئے تھے۔ یہ حیدر آبادی مجاہد میرے سینے میں موجزن جذبہ اسلام کو پھر سے تابندہ کر گیا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو اس کے پانچ منٹ بعد میں بھی کیبن سے باہر نکل آیا۔ اس وقت باہر رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ انڈیا کے جنوبی علاقے میں راتیں جنگلات اور سبزے کی وجہ سے بڑی تاریک ہوتی ہیں اور رات بڑی جلدی چھا جاتی ہے۔ میں قبرستان میں چلنے لگا۔ کسی طرف سے مینڈک کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ شاید ادھر کوئی تالاب تھا۔ سڑک پر بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں پرانے قبرستان والے بس سٹاپ پر آ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ کافی انتظار کے بعد ایک بس آئی۔ میں نے کنڈیکٹر سے کہا کہ مجھے ریلوے سٹیشن کا ٹکٹ دے دے۔ اس نے بتایا کہ ریلوے سٹیشن جانے والی بس مجھے چار مینار سے ملے گی۔ میں نے چار مینار تک کا ٹکٹ لے لیا۔ چار مینار کے سٹاپ پر اتر گیا۔ یہاں سڑک پر خوب ٹریفک اور روشنی تھی۔ چار مینار کی چوکور اور اونچے اونچے میناروں والی عمارت کے نیچے سے سڑک گزرتی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر مجھے سٹیشن جانے والی بس مل گئی اور میں ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ابھی گاڑی آنے میں کافی وقت تھا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا جسے ٹی ٹی نے حیدر آباد سے نکلتے ہوئے چیک کر لیا تھا۔ اس ٹکٹ میں ایک طرف سوراخ کیا گیا تھا۔ میں ٹکٹ دکھا کر اس پلیٹ فارم پر آ گیا جہاں سے مجھے نیلور کی طرف جانے والی مدراس میل ملنی تھی۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرتا رہا آخر ٹرین آ گئی۔ اور دوسرے

مسافروں کے ساتھ مجھے بھی لے کر مدراس کی طرف روانہ ہو گئی۔

اگر آپ کو کبھی اس طرف سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ حیدر آباد (دکن) سے نیلور تک کا سفر بھی کافی لمبا سفر ہے۔ حیدر آباد کے سٹیشن سے ریلوے کا ایک روٹ محبوب نگر کرنول اور اننت پور سے بنگلور تک کا ہے۔ ایک ریلوے لائن حیدر آباد سے گلبرگہ' شولا پور اور پونا سے ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی ہے۔ میں جس روٹ پر سفر کر رہا تھا وہ حیدر آباد سے وجے واڑہ یا بیجواڑہ' گنٹور اور آگے نیلور سے مدراس تک کا روٹ تھا۔ یہ ٹرین یعنی مدراس میل ساری رات اور دوسرا پورا دن چلتی رہی۔ دوسرے دن تیسرے پہر اس نے مجھے نیلور پہنچایا۔ نیلور سے میں ایک لاری میں بیٹھ کر ایلور نام کے ساحلی شہر پہنچ گیا۔ ایلور کا شہر یا بندرگاہ خلیج بنگال کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ ایلور سے ذرا نیچے کی جانب کسی دریا کا ڈیلٹا ہے۔ اس دریا کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ دریا یہاں سمندر میں گرتا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑوں کا رنگ گہرا قرمزی ہو رہا تھا۔ ساحلی شہر ایلور زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ بازاروں میں دکانیں کھلی تھیں۔ رکشوں کے علاوہ کہیں کہیں موٹر کاریں بھی چلتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف تھوڑی بلندی پر کوئی بہت بڑی عمارت تھی جس کے اوپر تلیگو زبان میں لکھا ہوا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کے رنگ یہاں زیادہ کالے ہو گئے تھے۔ عورتیں بھی کالی کالی تھیں۔ فضا ایسی تھی جیسے ہمارے پنجاب میں اگست کے مہینے میں ہوتی ہے۔ اپنے غازی کا ایڈریس میرے پاس تھا۔ شہر مختصر سا مگر بڑا صاف ستھرا اور کسی حد تک ماڈرن تھا۔ ایک آدمی سے میں نے پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اپنے غازی کا ٹھکانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں دو سنیما گھر آئے جہاں ایک سنیما ہاؤس میں ہندی کی اور دوسرے میں تلیگو کی فلم لگی ہوئی تھی۔ لوگوں کی اکثریت نے وہی مدراسی انداز میں دھوتیاں گھٹنوں سے اوپر تک اٹھا کر باندھی ہوئی تھیں اور جسم پر صرف بنیان ہی تھی۔ عورتوں نے جوڑوں میں سفید پھولوں کے گجرے ضرور سجائے ہوئے تھے۔ کوئی ہوٹل یا کافی کی دکان راستے میں آتی تو اندر سے تامل تلیگو اور کرناٹک سنگیت کے گانوں کی ریکارڈنگ سنائی دیتی کسی ریستوران سے ہندی فلموں کے گیت بھی سنائی دیتے تھے۔ میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ہمارا غازی رہتا تھا۔ یعنی جو ایڈریس مجھے حیدر آبادی مجاہد نے دیا ہوا تھا۔

میرے سامنے شام کے بڑھتے پھیلتے ملگجی اندھیرے میں ایک مچان کے اوپر بنا ہوا بانس کا مکان تھا جس کی سیڑھیوں میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ میں نے اپنے غازی کا نام لے کر اس سے کہا کہ مجھے اس سے ملنا ہے۔ وہ کھانستے ہوئے بولا۔

"ادھر جھومرے پٹی میں ملے گا"

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے پوچھا۔

"جھومرے پٹی میں کہاں ملے گا؟"

بوڑھے نے بڑے اطمینان سے ناریل کے حقے کے دو تین کش لگائے اور ایک بار پھر کھانسنے کے بعد بولا۔

"اس باجو کو جائے گا۔"

اس نے تین چار جملوں میں مجھے سمجھایا کہ جھومرے پٹی کہاں پر ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت مطلب نکالا اور جیسا اس نے بتایا تھا ویسے ہی ایک طرف چل پڑا۔ جس طرف بوڑھے نے مجھے جانے کے لئے کہا تھا اس طرف ایک کچا راستہ تھا جس کی دونوں جانب ناریل کے درخت کھڑے شام کی ہوا میں اپنی شاخوں کو ہلا رہے تھے۔ یہ جگہ چونکہ سمندر کے قریب تھی اس لئے اپنے کراچی شہر کی طرح یہاں بھی شام کے وقت سمندر کی طرف سے ہوا چلنے لگی تھی۔ یہ کچا راستہ ایک طرف کو مڑ گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد سامنے سڑک بند ہو گئی اور ایک انگریزی فلموں کی طرز کا کاٹیج نظر آیا جس کے آگے سبزے کا لان تھا۔ لان بالکل خالی پڑا تھا۔ کاٹیج بانس اور لکڑی کا پرانی طرز کا تھا۔ اس کی تکونی چھت کی پیشانی پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ ایک چھوٹا سا رستہ کاٹیج کے برآمدے تک جاتا تھا۔ اس کا کوئی گیٹ نہیں تھا۔ لان کے پیچھے میں نے دو موٹر کاریں کھڑی دیکھیں ایک ستون کے چوکور پتھر پر تلیگو اور انگریزی زبانوں میں جھومرے پٹی لکھا ہوا تھا۔ میری

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کوئی ہوٹل ہے یا کیا ہے۔ اتنے میں ایک عورت اندر سے آتی نظر آئی۔ وہ اپنی ساڑھی سے گھروں میں کام کرنے والی لگتی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"جھومرے پٹی یہی ہے؟"

اس نے تلیگو زبان میں کچھ کہا اور چلی گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ چونکہ میں نے چوکور ستون پر مٹے ہوئے انگریزی حروف میں جھومرے پٹی لکھا ہوا پڑھ لیا تھا اس لئے میں کاٹج کے برآمدے میں آگیا۔ یہاں مجھے اندر سے انگریزی میوزک کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں برآمدے میں رک گیا۔ کاٹج کے دروازے لکڑی کے تھے۔ کھڑکیاں بھی لکڑی کی تھیں اور بند تھیں۔ کہیں کہیں سے روشنی کی کرنیں باہر نکل رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا پراسرار لگا۔ آخر میں نے ہمت کر کے دروازے کے باہر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ تین چار مرتبہ بیل دینے پر دروازہ کھل گیا۔ اندر دھندلی دھندلی روشنی میں ایک درمیانے قد کی صحت مند جسم والی کالی عورت کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے جسم پر بغیر آستینوں کے ایک فراک ہی تھا۔ جس کا گریبان کافی نیچے تک گیا ہوا تھا۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔ اس علاقے میں جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں انگریزی زبان عام بولی جاتی ہے۔ میں نے اپنے غازی کا نام لیا عورت مسکراتے ہوئے ذرا ذرا ہل بھی رہی تھی۔ لگتا تھا اس نے کوئی نشہ کر رکھا ہے کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آجاؤ"

میں اندر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا اور میرے آگے آگے ذرا ذرا جھومتی اور منہ ہی منہ میں انگریزی کے کسی گانے کی دھن گنگناتی ہوئی چلنے لگی۔ ہم ایک سجے سجائے مگر خالی پڑے ہوئے کمرے میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں آئے تو وہاں انگریزی میوزک کی دھن پر بڑی دھیمی پر اسرار روشنیوں میں کالے کالے مرد عورتوں کے جوڑے انگریزی ڈانس کر رہے تھے۔ یہ ہال کمرہ تھا جس میں تین طرف

میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر بھی عورتیں اور مرد بیٹھے گلفام کے جام لنڈھا رہے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے اکثریت ریٹائرڈ قسم کے ادھیڑ عمر اور بوڑھے آدمیوں اور عورتوں کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی زیادہ اونچی آواز میں گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ خوبصورت جسم والی کالی عورت مجھے ہال کمرے کے کونے میں ایک کاؤنٹر کے پاس لے گئی جہاں سفید اور سرخ وردیوں والے تین چار بیروں کے درمیان ایک گہری سانولے رنگت والا کسرتی بدن کا ایک جوان عنابی رنگ کی ٹی شرٹ اور سیاہ رنگ کی پتلون میں ملبوس کھڑا انہیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

کالی عورت جو مجھے وہاں تک لائی تھی اس نے تلیگو زبان میں اس جوان آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر میری طرف اشارہ کر کے واپس چلی گئی۔ اس شخص نے میری طرف ایک سرسری نظر سے دیکھا اور بیروں کو ضروری ہدایات دے کر رخصت کیا اور میرے قریب آکر انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟ میں نے بھی انگریزی میں اس کا نام لے کر کہا کہ مجھے اس نام کے آدمی سے ملنا ہے۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں ہی ہوں تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے کاؤنٹر سے ہٹا کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں دیوار کے ساتھ شیشے کی الماریاں شراب اور بیئر کی بوتلوں سے بھری ہوئی لگی تھیں۔ درمیان میں لوہے کی ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم بیٹھ گئے۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے حیدر آبادی مجاہد نے اس کے پاس بھیجا ہے تو اپنی جیب سے سگار نما سگریٹ نکال کر سلگایا اور لائٹر بجھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے انگریزی میں کہنے

لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرلینا چاہئے۔ تاکہ ہمیں ایک دوسرے پر کوئی شک شبہ باقی نہ رہے۔"

حیدر آبادی مجاہد نے مجھے کوڈ کے دونوں جملے بتا دیئے تھے۔ ایک جملہ مجھے بولنا تھا۔ جس کے جواب میں دوسرا جملہ اس غازی کو بولنا تھا۔ میں نے اپنا خفیہ کوڈ کا جملہ بولا۔ اس کے جواب میں اس شخص نے جس کو میں اب غازی ہی کہوں گا بول دیا۔ تصدیق ہو گئی کہ ہم دونوں صحیح آدمی سے مل رہے ہیں۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"حیدر آباد سے مجھے اپنے ساتھی نے تمہارے مشن کے بارے میں ساری تفصیل بتادی تھی۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب ایسا ہے کہ یہاں ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ تم پہلے کبھی اس شہر میں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ میرا پہلا موقع ہے"

اس نے کچھ سوچ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"تم بیئر وغیرہ پیتے ہو؟"

میں نے نفی میں سرہلایا تو اس نے کہا۔

"پھر تم ایسا کرو کہ اس کلب کے پیچھے بھی ایک لان ہے۔ وہاں موسم خوشگوار ہوگا۔ یہاں تم شراب اور بیئر کی بو میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکو گے۔ پیچھے لان میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ تم وہاں جاکر میرا انتظار کرو مجھے یہاں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد میں تمہیں وہاں سے ساتھ لے لوں گا اور ہم اپنے کوارٹر میں جاکر تفصیلی بات چیت کریں گے۔ او کے؟"

میں نے کہا۔

"او کے"

اس نے دروازہ کھول کر عقبی لان میں جاتا راستہ دکھایا اور خود کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ میں ایک تنگ راہداری سے گزر کر عقبی لان میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے مچھر تنگ کرنے لگے۔ میں اٹھ کر لان میں ٹہلنے لگا۔ گھاس گیلی تھی جس سے میرے جوتے گیلے ہونے لگے تو میں لان کی دوسری طرف چھوٹی سی سڑک پر آگیا۔ یہاں کچھ فاصلے پر ایک مندر سے کرناٹک شیلی میں وائلن اور مردنگم پر جنوبی ہند کے کلاسیکی رقص کی دھن کی آواز آرہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ مندر میں جاکر دیوداسی کو رقص کرتے دیکھوں۔ مندر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اس کی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے سوچا ابھی اپنے غازی کے آنے میں آدھا گھنٹہ پڑا ہے۔ میں مندر میں رقص کرتی دیوداسی کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہوں۔ اس مندر کو ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ناریل کے درختوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا مندر کے احاطے میں آگیا۔ یہاں پجاری لوگ مندر میں آجارہے تھے۔ رقص کی دھن یہاں قریب سے سنائی دینے لگی تھی۔ میں اس دھن کی آواز پر اسے تلاش کرتا مندر کے پہلو میں ایک تنگ راستے سے گزر کر بے شمار ستونوں والے ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک سرخ ریشمی ساڑھی والی لڑکی' بالوں میں پھول سجائے' زبردست میک اپ کئے پورے کلاسیکی رقص کے لباس میں مردگم کی دھن پر شعلے کی طرح رقص کر رہی تھی۔

میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اس شعلہ جوالہ کا رقص دیکھنے لگا۔ جن لوگوں نے جنوبی بھارت کے مندروں میں ان کا کلاسیکی رقص دیکھا ہے اور ان کی تیز دھن والی موسیقی سنی ہے انہیں معلوم ہوگا کہ جنوبی ہند کی موسیقی کا انگ بڑا تیز ہوتا ہے۔ ردھم بھی تیز ہوتی ہے اس موسیقی کا ٹیکنیکل نام کرناٹک شیلی ہے۔ شیلی ان کی زبان میں صنف کو کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بولتے بھی تیز تیز ہیں۔ گاتے بھی تیز تیز ہیں۔ سبھا لکشمی یہاں کی مشہور کلاسیکل گانے والی ہے۔ یہ لوگ موسیقی کے بے حد شائق ہیں اور گانے والے کے ساتھ کبھی کبھی پنڈال میں بیٹھے سارے لوگ بھی گانے لگتے ہیں۔ مندر کی فضا لوبان اور اگربتیوں کی خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ یہ بوجھل فضا مجھے پریشان کر

رہی تھی۔

ویسے بھی مجھے اپنے غازی کا خیال لگا ہوا تھا۔ چنانچہ میں مندر سے نکل آیا۔ واپسی پر اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر سے گزر کر جب جھومرے پٹی کی عمارت کے لان میں داخل ہونے لگا تو اچانک ایک طرف سے تین آدمی نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ ان میں دو وہاں کی پولیس کی وردی میں تھے اور ایک سویلین لباس میں تھا۔ پولیس کے سپاہیوں میں سے ایک کے پاس رائفل تھی۔ دوسرے نے پستول میری طرف تان رکھا تھا۔ یہ پولیس انسپکٹر لگتا تھا۔ میں حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگا۔ پولیس انسپکٹر نے سامنے آتے ہی پستول کا رخ میری طرف کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ اگر ذرا حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔"

اس کے بعد کے لرزہ خیز واقعات بھارت کے فرعون کی آخری جلد "سرفروش مجاہد" میں ملاحظہ فرمائیے